طلوعِ اسلام

جنوری ۱۹۵۷ء

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ
طلوعِ اسلام
کراچی

بدل اشتراک: ہند و پاکستان سے سالانہ آٹھ روپے۔ غیر ممالک سے ۱۲ شلنگ

قیمت فی پرچہ ہند و پاکستان سے بارہ آنے

ٹیلیفون نمبر: ۴۱۴۹۹
خط و کتابت کا پتہ: ۱۵۹/۳۔ ایل۔ پی۔ ای۔ سی ہاؤسنگ سوسائٹی کراچی نمبر ۲۹

جلد ۱۰ | جنوری سنہ ۱۹۵۷ء | نمبر ۱

فہرست مضامین

نغمۂ محمد		۲—۴
لمعات		۵—۱۰
مجلس اقبال		۱۱—۱۶
تقدیر امم (سلیم کے نام)	(محترم پرویز صاحب)	۱۷—۳۲
کنونشن کے بعد	(محترم عبدالرب صاحب)	۳۳—۴۲
رابطۂ باہمی	(سکریٹری بزم طلوع اسلام کراچی)	۴۳—۴۴
اسلامی تعلیمات اور دورِ حاضر کے علومِ جدیدہ	(مولانا عبدالمنعم النمر صاحب)	۴۵—۴۹
قرآنی معاشرہ	(محترم عمر احمد صاحب عثمانی)	۵۱—۶۴
حقائق و عبر		۶۴—۶۹
نقد و نظر		۷۱—۷۳
باب المراسلات		۷۶—۷۷

نغمۂ محمد

علامہ اقبال کے پیام مشرق میں "جوئے آب" کے عنوان سے ایک نظم شامل ہے جس کے نیچے حسب ذیل نوٹ شائع ہوا ہے۔

"جوئے آب" گوئٹے کی مشہور نظم موسومہ بہ "نغمۂ محمد" کا ایک نہایت آزاد ترجمہ ہے۔ اس نظم میں جو دیوان مغربی سے بہت پہلے لکھی گئی تھی، المانی شاعر نے زندگی کے اسلامی تخیل کو نہایت خوبی سے بیان کیا ہے۔ اصل میں یہ ایک مجوزہ اسلامی ڈرامے کا جزو تھی جس کی تکمیل اُس سے نہ ہو سکی۔ اس ترجمے سے صرف گوئٹے کا نقطۂ نگاہ دکھانا مقصود ہے۔

جی چاہتا تھا کہ گوئٹے کی اس نظم کی اصل مل جائے تو کسی جرمن زبان جاننے والے سے اس کا لفظی ترجمہ سنا جائے۔ بارے، شیخ الجامعہ (دہلی) پروفیسر محمد مجیب صاحب نے اس نظم کا ترجمہ اخبار مدینہ (بجنور) میں شائع کرایا ہے جسے ہم جریدہ مذکور کے شکریہ کے ساتھ درج ذیل کرتے ہیں۔ عنوان ہے۔ "محمدؐ کا گیت"۔

"اُس چشمے کو دیکھو جو ستاروں کی کرنوں کی طرح ہنستا ہوا صاف شفاف چٹانوں سے نکلا، بچپن میں اسے قدسیوں نے اس دنیا میں پالا جو بادلوں سے پرے ہے۔ شباب کی تازگی اور جوش لئے ہوئے وہ ایک خرامِ ناز کے ساتھ بادلوں سے نکلتا، اور چٹانوں کے بیچ میں سے تہ بازیوں سے گذر کر مرمریں چٹانوں پر گرتا ہے اور پھر مسرت کے نعرے لگاتا ہوا آسمان کی طرف اُچھلتا ہے۔

وہ چوٹیوں کے درمیان دروں میں سے ایک رنگین پتھر سے دوسرے کی طرف لپکتا ہے۔ اس کے قدم کو شروع ہی سے رہنمائی کی صنعت عطا ہوئی ہے اور وہ اپنے بھائی ندیوں کو اپنے ساتھ بہا کرلے جاتا ہے۔

نیچے وادی میں جہاں اس کا قدم پڑتا ہے پھول کھلنے لگتے ہیں اور اس کے دم سے سبزہ زار میں جان پڑ جاتی ہے۔ لیکن اُسے نہ سایہ دار وادی روک سکتی ہے نہ وہ پھول جو اُس کے گھٹنوں سے لپٹ لپٹ کر محبت بھری آنکھوں سے اُس کی خوشامد کرتے ہیں۔ اس کا بہاؤ اسے میدان کی طرف چکر دیتا ہوا لے جاتا ہے۔

چھوٹے چشمے اس کے دامن سے لپٹ کر چلتے ہیں۔ اب وہ چاندی کی طرح چمکتا ہوا میدان میں پہنچتا ہے اور میدان بھی اس کی آب و تاب سے چمک اٹھتا ہے۔ اب میدان کے دریا اور پہاڑوں کے چشمے پکار پکار کر کہتے ہیں:-

"بھائی، اے بھائی! ہمیں بھی اپنے رب کے پاس لے چل ہمیں بھی بے پایاں سمندر کی گود میں پہنچا دے۔ وہ ہمارے انتظار میں

ہاتھ پھیلاتے ہے۔ اور افسوس، ہم اس کے مشتاق اس کی گود تک پہونچ نہیں پاتے۔ ہمیں ریگستانوں کی پیاسی ریت سوکھ لیتی ہے۔ اوپر سے سورج ہمارا خون چوس لیتا ہے۔ کوئی پہاڑی راستہ روک کر ہمیں تالاب بنا دیتی ہے۔ اے بھائی! اپنے میدان والے بھائیوں کو، اپنے پہاڑ والے بھائیوں کو اپنے ساتھ اپنے رب کے پاس لئے چل"۔

"آؤ سب کے سب آؤ"۔۔۔۔ اب وہ بڑی شان سے موجیں مارتا بڑھتا ہے۔ ساری قوم اپنے بادشاہ کو کندھوں پر اٹھائے ہوئے چلتی ہے اور فتح کے ریلے میں وہ ملکوں پر اپنا سکہ بٹھاتا جاتا ہے، جہاں اس کا پیر پڑتا ہے شہر آباد ہو جاتے ہیں۔

اُس کا بہاؤ کسی کے روکے نہیں رکتا۔ وہ زور شور سے میناروں کی چمکتی چوٹیوں، مرمریں عمارتوں کو پیچھے چھوڑ کر تخلیق کے جوش میں آگے بڑھا چلا جاتا ہے، گویا اطلس ایک دنیا کو کندھوں پر اٹھائے ہوئے ہے۔ اس کے سر پر ہزاروں جھنڈے لہراتے اور سرسراتے ہیں، اور یہ سب اس کی شان و شوکت کے نشان ہیں۔

اس طرح وہ اپنے بھائیوں، اپنے عزیزوں اپنے بچوں کو اُن کے رب کے پاس، جو ان کے انتظار میں تھا، پہنچا دیتا ہے اور وہ انھیں مسرت کے جوش میں گلے لگا لیتا ہے"۔

کتنے پاکیزہ ہیں یہ خیالات اور کیسی بلند پایہ ہے یہ نعت۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس لفظی ترجمہ کے ساتھ علامہ اقبال کا منظوم ترجمہ بھی سامنے آجائے۔ (م ہ ہذا)۔

جوئے آب

بنگر کہ جوئے آب چہ مستانہ می رود ۔۔۔ مانند کہکشاں بگریبانِ مرغزار
درخوابِ ناز بود بہ گہوارۂ سحاب ۔۔۔ واکرد چشمِ شوق بآغوشِ کوہسار
از سنگریزہ نغمہ کشاید خرامِ او ۔۔۔ سیمائے او چو آئینۂ بے رنگ و بے غبار

زی بحر بیکرانہ چہ مستانہ می رود
درخود یگانہ از ہمہ بیگانہ می رود

در راہِ او بہار پریخانہ آفرید ۔۔۔ نرگس دمید و لالہ دمید و سمن دمید
گل عشوہ داد و گفت یکے پیشِ ما بایست ۔۔۔ خندید غنچہ و سرِ دامانِ او کشید
ناآشنائے جلوہ فروشانِ سبز پوش ۔۔۔ صحرا برید و سینۂ کوہ و کمر درید

زی بحر بیکرانہ چہ مستانہ می رود
درخود یگانہ از ہمہ بیگانہ می رود

صد جوئے دشت و مرغ و دکستان و باغ و راغ — گفتند اے بسیط زمیں با تو سازگار
ما را کہ راہ از تنگ آبی نہ بردہ ایم — از دست بر دریگ بیاباں نگاہ دار
دا کردہ سینہ را بہ ہوائے شرق و غرب — در برگرفتہ ہمعنان زبون و زار

زی بحر بیکرانہ چہ مستانہ می رود
با صد ہزار گوہر یک دانہ می رود

دریائے پر خروش از بند و شکن گذشت — از تنگنائے وادی و کوہ و دمن گذشت
یکساں چو سیل کردہ نشیب و فراز را — از کاخ شاہ و بارہ و کشت و چمن گذشت
بیتاب و تند و تیز و جگر سوز و بیقرار — در ہر زماں بتازہ رسید از کہن گذشت

زی بحر بیکرانہ چہ مستانہ می رود
در خود یگانہ از ہمہ بیگانہ می رود

کتنا حسین اور دلکش ہے یہ منظوم ترجمہ۔ شاہاں بہ شاہاں می دہند اسی کو کہتے ہیں۔

طلوع اسلام اس سالِ نو کا آغاز اسی کہکشانی مقدس یادگار سے کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان جو جی میں آئے کر دیکھے۔ اسے منزلِ مقصود تک صرف وہی راستہ پہنچا سکے گا جس پر محمد رسول اللہ والذین معہ کے نقوشِ قدم درخشندہ ستاروں کی طرح جگ مگ جگ مگ کر رہے ہیں۔

منزل ملی، مقام ملا۔ مدعا ملا
سب کچھ مجھے ملا جو ترا نقشِ پا ملا

یہی وجہ ہے کہ قرآن نے ان نقوش کو اپنے دامن میں اس طرح محفوظ کر رکھا ہے۔

اقبال اور قرآن

از:- پرویز

علامہ اقبال کے قرآنی پیغام سے متعلق محترم پرویز صاحب کے انقلاب آفریں مقالات کا مجموعہ

ضخامت ۲۵۶ صفحات ——— قیمت:- دو روپے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

اگر کسی معاشرہ میں ہر طرف فساد ہی فساد رونما ہو جائے اور کوئی شے اپنی اصلی حالت پر نہ رہے تو اس کا لازمی نتیجہ عالمگیر مایوسی ہوتا ہے۔ مایوسی کے معنی یہ ہیں کہ کسی کو سوجھتا نہیں کہ ان حالات کو سدھارنے کیلئے کیا کیا جائے ساری قوم ایکدوسرے کو موردِ الزام قرار دینے میں مصروف ہوتی ہے۔ ہر شخص ان بگڑے ہوئے حالات کا شکوہ سنج ہوتا ہے اور دوسروں کو اس کا ذمہ دار قرار دیکر مطمئن ہو جاتا ہے کہ میں اپنے فریضہ سے سبکدوش ہو گیا۔ لیڈر اپنی تقریریں قوم کو کوستے ہیں کہ وہ کچھ نہیں کرتی اور قوم لیڈروں کو مطعون کرتی رہتی ہے کہ وہ بالکل نکمے اور بے ایمان ہیں۔ قرآن نے جہنم میں عوام اور لیڈروں کی باہمی گفتگو کا ذکر کیا ہے جو اسی حقیقت کی ترجمان ہے۔ يَقُولُ الَّذِينَ اسْتُضْعِفُوا لِلَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا لَوْلَا أَنْتُمْ لَكُنَّا مُؤْمِنِينَ جو کمزور تھے وہ اپنے بڑوں سے جو متکبر تھے کہیں گے کہ تم نے ہمارا بیڑا غرق کیا) اگر تم نہ ہوتے تو ہم یقیناً سچائی کو ماننے والے ہوتے ہم غلط راستے پر نہ چلتے۔ اسکے جواب میں لیڈر کہیں گے کہ أَنَحْنُ صَدَدْنَاكُمْ عَنِ الْهُدَىٰ بَعْدَ إِذْ جَاءَكُمْ بَلْ كُنْتُمْ مُجْرِمِينَ تم کیا کہتے ہو؟ کیا ہم نے تمہیں روکا تھا کہ جو سچی راہنمائی تمہارے پاس آچکی ہے اسے قبول نہ کرو؟ کیوں خواہ مخواہ الزام ہمارے سر دھرتے ہو تم خود مجرم تھے اور اب ہمیں اس کا ذمہ دار ٹھہراتے ہو) وہ جواب میں کہیں گے کہ تمہیں یہ کہتے ہوئے شرم نہیں آتی۔ بَلْ مَكْرُ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ إِذْ تَأْمُرُونَنَا أَنْ نَكْفُرَ بِاللَّهِ وَنَجْعَلَ لَهُ أَنْدَادًا (۳۴/۳۱-۳۳) تم دن رات اس قسم کی سازشیں اور تدبیریں کرتے رہتے تھے اور ایسے احکام مدون اور نافذ کیا کرتے تھے جن سے ہم خدا کے قانون سے انکار کر کے انسانوں کے خود ساختہ قوانین کو ان کے ساتھ ملا دیں۔ اسلئے بتاؤ کہ اس جہنم کے ذمہ دار ہم ہیں یا آپ؟ اسی طرح دوسرے مقام پر ہے کہ عوام کہیں گے کہ رَبَّنَا أَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَاءَنَا فَأَضَلُّونَا السَّبِيلَا (۳۳/۶۷-۶۸) اے پروردگار! ہم نے اپنے مذہبی پیشواؤں اور سیاسی لیڈروں کی اطاعت کی۔ سو انھوں نے ہمیں راہ سے گمراہ کر دیا۔ رَبَّنَا آتِهِمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ الْعَذَابِ وَالْعَنْهُمْ لَعْنًا كَبِيرًا (۳۳/۶۷-۶۸) اے پروردگار! تو انھیں دگنا عذاب دیجئو۔ اور انھیں زندگی کی خوشگواریوں سے بالکل محروم رکھیو۔

اس میں شبہ نہیں کہ قرآن قوموں کی تباہی کے لئے بنیادی طور پر ان کے لیڈروں ہی کو ذمہ دار قرار دیتا ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ بَدَّلُوا نِعْمَتَ اللَّهِ كُفْرًا کیا تو نے ان لوگوں کی حالت پر غور نہیں کیا۔ جنھیں اللہ نے اس قدر نعمتوں سے نوازا لیکن انھوں نے ان کی قدر نہ کی۔ جس کے ہاتھ میں جو کچھ آیا دبا کر بیٹھ گیا۔ اور اس طرح دَارَ الْبَوَارِ

انھوں نے اپنی قوم کے کاروان کو تباہی اور بربادی کی منزل میں جا اتارا جَهَنَّمَ یعنی جہنم میں۔ یَصْلَوْنَهَا اور خود بھی اسی جہنم میں جا پہنچے وَبِئْسَ الْقَرَارُ۔ اور وہ کیسا برا ٹھکانہ ہے۔ اس کے بعد اسی الزام کو دہرایا گیا ہے جو عوام ان پر عائد کرتے تھے یعنی وَجَعَلُوا لِلّٰهِ اَنْدَادًا لِّيُضِلُّوا عَنْ سَبِيْلِهٖ (۱۴/۳۰) یہ لوگ قوانین خداوندی کے ساتھ اپنے (اور دوسروں کے) خود ساختہ قوانین کو شامل کرتے تھے تاکہ لوگوں کو خدا کے راستے سے گمراہ کریں۔ اسی لئے کہا کہ یہ لوگ اپنے جرائم کا بھی خمیازہ بھگتیں گے اور ان لوگوں کے جرائم میں سے بعض کا خمیازہ بھی جنہیں یہ گمراہ کیا کرتے تھے (۱۶/۲۵)۔ لیکن اس کے ساتھ ہی قرآن یہ بھی کہتا ہے کہ اس سے یہ عوام بھی جہنم سے نہیں نکل سکیں گے۔ انھیں اس کی حسرت ہی رہے گی کہ انھوں نے ان لیڈروں سے قطع تعلق کر کے صحیح راستہ کیوں اختیار نہیں کیا تھا؟ (۲/۱۶۶-۶۷)

عوام اور لیڈروں کی باہمی الزام دہی کے علاوہ قرآن یہ بھی بتاتا ہے کہ ہر نسل (عصر یا زمانہ) کے لوگ اپنی تباہی اور بربادی کے لئے ان لوگوں کو ذمہ دار ٹھہراتے ہیں جو ان سے پہلے ہو گذرے تھے۔ وہ ہمیشہ یہ کہتے ہیں کہ ہمارے پہلوں نے یہ کچھ کیا اور ہم اس کی پاداش میں جہنم میں گل سڑ رہے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ ان کی یہ عذر تراشیاں بے بنیاد ہیں۔ اگر پہلوں نے کوئی غلطی کی تھی تو یہ اُسے درست کیوں نہیں کرتے؟ انھیں کیا مجبوری ہے کہ یہ غلط روش چھوڑ کر صحیح روش اختیار نہ کر لیں؟ اس لئے اس جہنم کے عذاب کے یہ بھی برابر کے ذمہ دار ہیں۔ سورۂ اعراف میں ہے كُلَّمَا دَخَلَتْ اُمَّةٌ لَّعَنَتْ اُخْتَهَا جب کوئی جماعت جہنم میں داخل ہو گی تو وہ اپنی ساتھی جماعت پر لعنت کرے گی حَتّٰٓى اِذَا ادَّارَكُوْا فِيْهَا جَمِيْعًا حتیٰ کہ جب یہ سب جہنم میں ایک دوسرے کو پالیں گے تو قَالَتْ اُخْرٰىهُمْ لِاُوْلٰىهُمْ بعد میں آنے والے اپنے پیشروؤں کے متعلق کہیں گے کہ رَبَّنَا هٰٓؤُلَآءِ اَضَلُّوْنَا فَاٰتِهِمْ عَذَابًا ضِعْفًا مِّنَ النَّارِ اے ہمارے پروردگار! یہ ہیں جنھوں نے ہمیں گمراہ کیا تھا۔ سو تو انھیں تباہی کا دگنا عذاب دے قَالَ لِكُلٍّ ضِعْفٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَعْلَمُوْنَ خدا ان سے کہے گا کہ تم میں سے ہر ایک کے لئے دگنا عذاب ہے تم جو ایک دوسرے کو الزام دیتے ہو تو یہ چیز تمہاری لاعلمی کی دلیل ہے۔ اگر پہلوں کا تصور یہ ہے کہ انھوں نے اپنی آنے والی نسل کی تعلیم و تربیت غلط فضا میں کی اور اس طرح جس جہنم میں خود تھے اُسے ان آنیوالے لوگوں کی طرف بھی منتقل کر دیا۔ تو بعد میں آنے والوں کا جرم یہ ہے کہ انھوں نے جانتے بوجھتے اس غلط معاشرے کو قائم کیوں رکھا۔ جس کا نتیجہ ذلت و رسوائی کا جہنم تھا۔ انھوں نے اسے بدلنے کی کوشش کیوں نہیں کی اس اعتبار سے پہلے اور پیچھے سب برابر ہیں وَقَالَتْ اُوْلٰىهُمْ لِاُخْرٰىهُمْ فَمَا كَانَ لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ (۳۸/۳۹) پہلے ان پچھلوں سے کہیں گے کہ تمہیں ہم پر کوئی فوقیت نہیں تم اپنے اعمال کے خود ذمہ دار ہو۔ سو ان کے نتائج بھگتو۔ الزام کے لئے ہمیں کیوں مورد الزام ٹھہراتے ہو؟

مندرجہ بالا آیات میں جو کچھ کہا گیا ہے غور کرنے پر معلوم ہو گا کہ ان میں گویا خود ہمارا ہی نقشہ کھینچا گیا ہے۔ پاکستان ایک متاعِ گراں بہا تھی جو ہمیں فطرت کی طرف سے بطور نعمت ملی۔ لیکن ہم نے اس نعمت کی سخت ناقدری کی اور اپنی قوم کو جہنم کی کاروانی سرائے میں آن اتارا۔ اب اس جہنم میں کبھی ہم مرنیوالوں کو کوستے ہیں کہ انھوں نے فلاں غلطی کی اور فلاں فیصلہ صحیح نہ کیا

جس کی وجہ سے ہم اس عذاب میں مبتلا ہیں۔ اور کبھی عوام لیڈروں کو کوستے ہیں اور لیڈر عوام میں کیڑے ڈالتے ہیں۔ یہ کچھ کرنے کے بعد ہم مطمئن ہو جاتے ہیں کہ ہم اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہو گئے۔ ہم مطمئن ہو جاتے ہیں۔ اور جہنم کے شعلے دن بدن بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اس جہنم سے نکلنے کی کوئی صورت بھی ہے۔ اور اگر ہے تو اسے عمل میں لانے کا طریق کیا ہے؟

جب آپ پاکستان کے موجودہ معاشرے پر نگاہ ڈالیں گے تو یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ اس میں کوئی خاص پرزہ خراب نہیں جس کے بدلنے سے معاشرے کی اصلاح ہو جائے گی۔ یہ خرابی اس پورے نظام (SOCIAL ORDER) کی ہے جو یہاں کارفرما ہے۔ اسلئے ہمارے معاشرے کے اصلاح کی ایک ہی صورت ہے۔ اور وہ یہ کہ یہاں موجودہ غیر قرآنی نظام کی جگہ قرآنی نظام متشکل کیا جائے۔ قرآنی نظام کی تفاصیل تو طول طویل ہیں۔ لیکن اس کا ملخص یہ ہے کہ یہ نظام تمام افراد معاشرہ کی بنیادی ضروریات زندگی اور ان کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما کے سامان وذرائع بہم پہنچانے کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ ذمہ داری کا لفظ خاص طور پر قابل غور ہے۔ یعنی وہ نظام یہ کہہ کر فریب نہیں دے سکتا کہ ہم اس کے لئے کوشش کرینگے۔ وہ اس کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ بالفاظ دیگر اگر اس نظام میں کوئی ایک فرد بھی بھوکا رہ جائے یا اسے سامانِ نشوونما میسر نہ آئے تو وہ قرآنی نظام نہیں کہلا سکے گا۔ ظاہر ہے کہ اس عظیم ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ضروری ہوگا کہ ملک کے تمام ذرائع پیداوار کا نظم ونسق خود اس نظام کے ہاتھوں میں ہو اور فاضلہ دولت (SURPLUS MONEY) کسی جگہ بھی جمع نہ ہونے پائے۔ یہ قرآنی نظام کی بنیادی خصوصیات ہونگی۔ قرآن اس کے لئے جذبۂ محرکہ یہ بتاتا ہے کہ انسانی ذات (انا۔ خودی۔ نفس۔ ایغو PERSONALITY) کی نشوونما اس شے سے ہوتی ہے جسے وہ فرد کسی دوسرے کی نشوونما کے لئے دیتا ہے۔ جب انسانی ذات کی نشوونما اس طرح ہو جائے تو وہ حیاتِ جاوید حاصل کر لیتی ہے۔ اور اس طرح مرنے کے بعد زندگی کی اگلی ارتقائی مراحل طے کرنے کے قابل ہو جاتی ہے۔

یہ تو ہوا مقصد۔ یعنی موجودہ نظام کی جگہ قرآنی نظام کا قیام۔ اب سوال یہ ہے کہ بحالات موجودہ اس مقصد کے حصول کا طریقہ کیا ہوگا۔ یعنی پاکستان میں اس قسم کا نظام کس طرح قائم ہوگا؟ پاکستان ایک آئینی مملکت ہے۔ اس لئے اس میں ایک نظام کی جگہ دوسرا نظام لانے کا طریق بھی آئینی ہی ہوگا۔ آئینی تبدیلی کے معنی یہ ہیں کہ ملک کی مجالسِ قانون سازیں اکثریت ان لوگوں کی ہو جو اس قسم کے نظام کو اپنے ایمان کا جزو سمجھتے ہوں۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ ملک کی ان مجالس میں (وہ مرکزی ہوں یا صوبائی) اراکین انتخاب کے ذریعہ آتے ہیں اور ان انتخابات میں آراء (VOTES) کی اکثریت عوام کی ہوتی ہے۔ حالات کے اس تجزیے سے آپ نے دیکھ لیا کہ اس امر کا بنیادی اختیار عوام کے ہاتھ میں ہے کہ وہ ملک میں کس قسم کا نظام قائم کریں۔ لہٰذا عوام کا ان لوگوں کو موردِ الزام قرار دینا جو پہلے کسی قسم کا نظام قائم کر گئے ہوں یا اپنے لیڈروں کو کوسنا کہ وہ غلط راستے پر چل رہے ہیں۔ اپنے اختیارات سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔

لیکن کہا یہ جائے گا کہ عوام بیچارے جاہل ہیں۔ ان کا سیاسی شعور بیدار نہیں۔ وہ صحیح اور غلط نظام کو سمجھ نہیں سکتے۔ وہ اچھے برے نمائندے میں تمیز نہیں کر سکتے۔ وہ اس قدر غریب اور مفلس ہیں کہ روٹی ٹکا دھندا انہیں کسی دوسری طرف توجہ ہی نہیں کرنے

دیتا۔ معاشی مجبوریوں نے انھیں اس قدر کچل دیا ہے کہ انھیں ملک کے آئینی اور سیاسی معاملات میں دلچسپی ہی نہیں رہی۔ نیز جیسا کہ قرآن نے خود کہا ہے کہ مفاد پرست گروہ اس قسم کی سازشیں اور تدبیریں کرتا رہتا ہے جن سے عوام کا شعور بیدار ہی نہ ہو۔ تو اب کیا جائے تو کیا کیا جائے؟

یہ ظاہر ہے کہ جب تک آپ کے ہاں جمہوری نظام ہے اس وقت تک عوام کے تعاون کے بغیر کوئی آئینی انقلاب رونما ہو نہیں سکتا لہٰذا عوام میں صحیح نگاہوں کا پیدا کرنا معاشرہ کی اصلاح کے لئے لاینفک ہے۔ اس کے بغیر آپ قیامت تک بھی کوئی تبدیلی پیدا نہیں کر سکتے۔

اور یہ بھی ظاہر ہے کہ مفاد پرست گروہ کی انتہائی کوشش یہ ہوگی کہ عوام میں صحیح نگاہ پیدا نہ ہو سکے۔ لہٰذا عوام میں صحیح نگاہ پیدا کرنے کی ذمہ داری ان پر عائد ہوتی ہے جو

(۱) خود قرآنی نظام سے واقف ہوں اور اس کے قیام کے لئے مضطرب و بیقرار ہوں۔ اور

(۲) جن کے سامنے اپنا مفاد کوئی نہ ہو۔

پاکستان میں قرآنی نظامِ ربوبیت کی نشاندہی طلوع اسلام نے کرائی ہے۔ اس لئے وہی طبقہ اس نظام سے اچھی طرح باخبر ہے جو طلوع اسلام اور اس کے شائع کردہ لٹریچر کو اپنے دل کی گہرائیوں میں اتار چکا ہے۔ ہمارے پاس ایسا باور (بلکہ یقین) کرنے کے لئے کافی شواہد موجود ہیں کہ ملک میں اس قسم کے حضرات کی اب کمی نہیں۔ طلوع اسلام کی سالقہ کونشن خود اس حقیقت کی زندہ شہادت تھی۔ نیز اس امر کی بھی کہ ان کے دلوں میں اس نظام کی تشکیل کے لئے بڑی تڑپ ہے۔ اور ان کے سامنے اپنا کوئی مفاد نہیں۔ حتیٰ کہ نام اور نمود کی بھی خواہش نہیں۔ وہ ملک کے ایسے دور دراز گوشوں میں جن کے نام تک سے بھی باہر کی دنیا کم واقف ہے، نہایت خاموشی سے اس قرآنی فکر کو آگے بڑھانے میں مصروف ہیں۔ اور اس میں جس قدر تکالیف سامنے آتی ہیں انھیں نہایت خندہ پیشانی سے برداشت کرتے ہیں یہی وہ طبقہ جس پر یہ فریضہ عائد ہوتا ہے کہ وہ عوام میں ایسی صحیح نگاہ پیدا کریں کہ وہ برے اور بھلے میں تمیز کر سکیں اور آئندہ انتخابات میں صرف ان لوگوں کو کامیاب بنائیں جو قرآنی نظام پر ایمان رکھتے ہوں۔

اس سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ آپ پر کتنی بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ اور اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لئے آپ کو کس قدر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ کرنے کا کام یہ ہے کہ ملک کے ایک ایک فرد کو نظامِ ربوبیت سے آشنا کرایا جائے۔ یہ کام ذاتی بات چیت سے بھی ہوگا اور لٹریچر کی تقسیم سے بھی۔ طلوع اسلام کی طرف سے جو کچھ اس وقت تک شائع ہو چکا ہے وہ اس نظام سے متعارف کرانے کے لئے بہت کافی ہے (اس میں مزید اضافہ بھی بدستور اور مسلسل ہوتا رہتا ہے) ضرورت اس کی ہے کہ اس لٹریچر کو گھر گھر پہنچایا جائے۔ اس کا ترجمہ علاقائی زبانوں میں کیا جائے۔ پھر اسے ذاتی طور پر مختلف کونوں اور گوشوں میں پہنچایا جائے۔ نجی ملاقاتوں میں اس کے متعلق گفتگو کی جائے۔ اور یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ آپ کو اس کی دُھن لگ جائے۔ آپ سفر میں ہوں یا حضر میں۔ اپنے مکان پر ہوں یا کسی دوسرے کے۔ شادی کی تقریب میں ہوں یا غمی کی۔ مسجد میں ہوں یا مدرسہ میں۔ آپ کسی جگہ اور کسی

مقام پر ہوں، یہی نقطہ آپ کا موضوعِ گفتگو ہو۔ یعنی قرآنی نظامِ ربوبیت کا تعارف۔ اور اس ابتدائی تعارف کے بعد جب آپ سننے والوں میں کچھ دلچسپی دیکھیں تو ان تک ضروری لٹریچر پہنچایا جائے۔ اور اس تمام جد و جہد اور سعی و کاوش سے آپ کا ذاتی مفاد کوئی بھی پیش نظر نہ ہو۔ آپ کا قول و فعل۔ سیرت و کردار اس عظیم حقیقت کا اعلان ہو کہ مَآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ مِنْ اَجْرٍ۔ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلٰی رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (۲۶/۱۰۹) میں اس کے لئے تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا۔ میرا اجر صرف خدا کی ربوبیت عالمینی کے ذمے ہے۔

لیکن یہ کام انفرادی طور پر کما حقہٗ نہیں ہو سکیگا۔ اس کے لئے اجتماعی اور منظم کوشش (ORGANISED EFFORT) کی ضرورت ہوگی۔ ان کوششوں کا مرکز اور محور ہر شہر اور قریہ کی مقامی بزمِ طلوعِ اسلام ہوگی جو وقتاً فوقتاً مرکزی بزم سے راہنمائی حاصل کرتی رہے گی۔ لہٰذا سب سے پہلے مقدم کام ان بزموں کو زندہ۔ فعال۔ متحرک اور منظم بنانا ہے۔ آپ اپنی اپنی جگہ مل کر بیٹھئے اور سوچئے کہ اس ضمن میں آپ نے کیا کچھ کیا ہے اور کیا کچھ کرنا ہے۔

اسے بھی نہ بھولئے کہ اس کام میں آپ کی سخت مخالفت ہوگی۔ یہ بات بظاہر بڑی تعجب انگیز سی معلوم ہوگی کہ جب آپ خالص قرآنی نظام کی طرف دعوت دیتے ہیں اور دعوت بھی مسلمانوں ہی کو دیتے ہیں جن کا قرآن پر ایمان ہے۔ اس میں کسی فرقہ یا پارٹی سے متصادم نہیں ہوتے۔ اس کے بدلے میں کسی سے کچھ نہیں چاہتے۔ اپنے سامنے کوئی ذاتی مفاد نہیں رکھتے تو پھر آپ کی مخالفت کیوں ہوگی اور کن لوگوں کی طرف سے ہوگی؟ آپ کی مخالفت مفاد پرست گروہ کی طرف سے ہوگی اور اس لئے ہوگی کہ آپ ان کی ہوسِ خوں آشامی کی تسکین کی راہ میں حائل ہوں گے۔ آپ ان کے شکار کو ان کے فولادی پنجوں سے چھڑانے کی کوشش کرینگے آپ ان کی جھوٹی سیادت و قیادت کو ختم کرنے کی کوشش کریں گے تاکہ خدا اور ان کے بندوں کے درمیان کوئی طاقت حائل نہ رہے اس سے سرمایہ داری اور اس کی محافظ مذہبی پیشوائیت دونوں متحدہ طور پر آپ کی مخالفت میں محاذ بنا لیں گی۔ ایک طبقہ اپنا پیسہ خرچ کرے گا اور دوسرا مذہب کے نام پر عوام کے جذبات کو مشتعل کرے گا۔ قرآن اس کی شہادت دیتا ہے اور ہمارا اپنا تجربہ اس کی تائید کرتا ہے۔ جب سے طلوعِ اسلام نے اس آواز کو بلند کیا ہے مذہبی اجارہ داروں کا ایک گروہ ہے جس نے اس کی مخالفت کو اپنی زندگی کا فریضہ قرار دے رکھا ہے چونکہ اس سے ان کا مقصود اپنے مفاد کا تحفظ ہے اس لئے وہ اس مخالفت میں ہر قسم کا حربہ استعمال کرتے ہیں۔ دروغ بافی اور بہتان تراشی ان کا عام شیوہ ہے۔ انھیں یہ کہنے کی تو جرأت نہیں ہوتی کہ ہم اس آواز کی مخالفت اس لئے کرتے ہیں کہ یہ سرمایہ داری کی خون آشامی اور پیشوائیت کی کفن دُزدی کی مخالف ہے۔ وہ عوام کو یہ کہہ کر فریب دیتے ہیں کہ یہ ایک نئے مذہب کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ شانِ رسالت کے منکر ہیں۔ تین نمازوں کے قائل ہیں۔ تو دن کے روزے رکھتے ہیں۔ مسلمانوں میں فتنہ پھیلاتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ وہ سرمایہ داروں کے پیسے کے زور پر اپنے اس پراپیگنڈہ کو وسیع سے وسیع تر پیمانے پر لئے جاتے ہیں۔ ان کے رسالے ہیں۔ اخبارات ہیں۔ پمفلٹ ہیں۔ کتابیں ہیں۔ تنخواہ دار کارندے ہیں۔ وظیفہ خوار ائمہ مساجد ہیں۔ وہ اپنی ان بہتان تراشیوں کو لوگوں تک مسلسل پہنچاتے رہتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ ہی انھیں تاکید کرتے رہتے ہیں کہ تم نے طلوعِ اسلام اور اس کا لٹریچر ہرگز نہ دیکھنا۔ اس سے تمہارے عقائد خراب ہو جائیں گے۔ اور عاقبت بگڑ جائے گی۔ مقصد اس سے

یہ ہوتا ہے کہ لوگوں پر کہیں ان کے جھوٹ کا پردہ فاش نہ ہو جائے۔

یہ ہے وہ مخالفت جس سے آپ کو بچنا ہوگا۔ اس سے بچنے کا طریق یہ ہے کہ آپ ان لوگوں سے کبھی نہ الجھئے۔ ان کی ٹکنیک یہ ہے کہ وہ آپ کو ان بے کار مباحث میں الجھائے رکھیں تاکہ آپ قرآنی نظام کا پیغام لوگوں تک نہ پہنچا سکیں۔ آپ اس سے بچیں اور اپنا مثبت پروگرام جاری رکھیں۔ ان کے اتہامات کی تردید اپنے عمل و کردار سے کریں۔ آپ کی زندگی آپ کی صداقت کی شہادت اور آپ کے دعوے کی دلیل ہو۔ اپنے مقصد کے حصول کے لئے کوئی ناجائز حربہ استعمال نہ کریں۔ کوئی غلط قدم نہ اٹھائیں جھوٹ کا کوئی کلمہ اپنی زبان پر نہ لائیں۔ مداہنت یا منافقت کو پاس تک نہ پھٹکنے دیں۔ کبھی ایسا نہ کریں کہ آپ کا عقیدہ کچھ اور ہو اور مصلحت بینی کی بناء پر زبان پر کچھ اور لائیں۔ قرآنی پیغام کی نشر و اشاعت کے لئے قلب و زبان کی ہم آہنگی نہایت ضروری ہے۔ آپ نے کسی سیاسی مقصد کو حاصل نہیں کرنا کہ آپ کے نزدیک اس مقصد کے حصول کا نام کامیابی ہو خواہ اس کے لئے کوئی ذرائع بھی استعمال کیوں نہ کر لئے جائیں۔ قرآن کی رو سے ذریعہ اور مقصد یا راستہ اور منزل میں کوئی فرق نہیں۔ غلط راستہ انسان کو کبھی صحیح منزل تک نہیں لے جاتا۔

ان شرائط کے ساتھ آپ قرآنی پیغام کو عام کرتے جائیں۔ تاکہ عوام اچھی طرح سمجھ جائیں کہ صحیح اسلامی زندگی کسے کہتے ہیں اور قرآنی نظام کیا ہوتا ہے اور جب انتخابات کا وقت آئے تو وہ صرف انہی لوگوں کو اپنا نمائندہ منتخب کریں جو اس نظام کو جزو ایمان سمجھیں۔ اگر آپ نے زیادہ سے زیادہ تعداد میں ایسے لوگوں کو منتخب کرا دیا جو اس نظام پر ایمان رکھتے ہیں تو مجلس قانون ساز میں اکثریت انہی لوگوں کی ہوگی۔ اس سے وہ موجودہ آئین پاکستان میں (جو سرمایہ دار ارباب اقتدار اور مذہبی پیشواؤں کی ملی بھگت کا مظہر ہے اور جسے محض فریب دہی کی خاطر اسلامی نام دیا گیا ہے) ضروری ترمیم کر لیں گے۔ اور اس کے بعد ملک میں صحیح قرآنی نظام نافذ کرنے کے قابل ہو سکیں گے۔ بحالات موجودہ، پاکستان میں صحیح معاشرہ کے قیام کی یہی ایک صورت ہے۔

امید ہے طلوع اسلام سے متفقین حضرات تاریخ کے اس نازک دور میں اپنی اہم ذمہ داری کا پورا پورا احساس کریں گے۔ اگر انہوں نے اس موقع کو کھو دیا تو معلوم ایسے حالات پھر کب پیدا ہوں۔ فھل من مدکر۔

فردوسِ گم گشتہ

از:- پرویز

محترم پرویز صاحب کی بلند پایہ تصنیف — برلم سائز ۱۶ ۔ ۴۱۶ صفحات ۔ قیمت چھ روپے

مجلسِ اقبال

بارھواں باب

دریں باب کہ مسلمان کی زندگی کا مقصد، قانونِ خداوندی کا غلبہ اور جہاد ہے۔
اور اگر جہاد کا جذبۂ محرکہ ہوسِ زمیں گیری ہو تو وہ اسلام میں حرام ہو جاتا ہے۔

اس باب کی ابتداء اس شعر سے ہوتی ہے۔

قلب را از صبغتہ اللہ رنگ دہ
عشق را ناموس و نام و ننگ دہ

عشاق کا یہ فخریہ اعلان قریب قریب ہر زبان پر ہوتا ہے کہ

ما نمی خواہیم ننگ و نام را

اور اس حقیقت کو میرؔ اس انداز میں بیان کرتا ہے کہ

پھرتے ہیں میرؔ خوار کوئی پوچھتا نہیں
اس عاشقی میں عزتِ سادات بھی گئی

لیکن یہ اس عشق کی باتیں ہیں جس کا نتیجہ کوچہ گردی ہوتا ہے۔ عشق کو اس پستی سے اٹھا کر انسانیت کے بلند ترین مقام پر لے جانے کا طریق یہ ہے کہ انسان کے دل میں قوانینِ خداوندی کا عشق پیدا ہو اور اس طرح وہ اپنے آپ کو صبغۃ اللہ (اللہ کے رنگ) میں رنگتا چلا جائے۔ انسانی ذات کی نشوونما کی پہچان یہ ہے کہ اس میں صفاتِ خداوندی (علیٰ حد بشریت) منعکس ہوتی چلی جائیں۔

طبعِ مسلم از محبت قاہر است
مسلم ار عاشق نباشد کافر است

مسلمان کے دل میں غلبہ اور قوت درحقیقت اپنے مقصدِ بلند کے ساتھ والہانہ عشق سے پیدا ہوتی ہے۔ عشق سے مراد یہ ہے کہ اس مقصد کے حصول کے لئے انسان اپنی عزیز ترین متاع تک کو بھی قربان کرنے کے لئے ہر وقت تیار رہے۔ اگر مسلمان کو اپنے مقصد سے

اس قدر شیفتگی نہیں تو وہ درحقیقت مسلمان نہیں، اور اس شیفتگی کا مظاہرہ اس روش زندگی سے ہوتا ہے جس میں مسلمان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ

تابع حق دیدنش، نادیدنش
خوردنش، نوشیدنش، خوابیدنش

اس کا کسی چیز کو درخورِ توجہ سمجھنا اور کسی طرف سے آنکھ بند کر کے گذر جانا۔ اس کا کھانا پینا۔ سونا سب قوانینِ خداوندی کے مطابق ہوتا ہے۔ اس کی ساری زندگی اس حقیقت کبریٰ کی جیتی جاگتی تصویر ہوتی ہے کہ قل ان صلاتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العالمین۔ ان سے کہدو کہ میری صلوٰۃ اور مناسک۔ میری زندگی اور میری موت سب اللہ رب العالمین کے لئے ہے جب ایک عبد مومن اس درجہ قوانین الٰہی کا پابند ہو جاتا ہے تو اس کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ

در رضائش مرضیٔ حق گم شود
ایں سخن کے باور مردم شود

خدا کی مرضی خود اس مومن کی مرضی میں گم ہو جاتی ہے۔ عام طور پر کہا یہ جاتا ہے کہ انسان کو ایسی زندگی بسر کرنی چاہیئے کہ اس کی اپنی مرضی کچھ نہ رہے بلکہ وہ مرضیٔ مولا میں گم ہو جائے۔ لیکن اقبال کا تصور اس سے مختلف ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ایک عبد مومن کو اس قسم کی زندگی بسر کرنی چاہیئے کہ کسی معاملہ میں جب اس کے فیصلہ اور کردار پر نظر ڈالی جائے تو اس سے واضح ہو جائے کہ اس معاملہ میں خدا کی مرضی یہی ہے جو اس کے فیصلے اور کردار سے ظاہر ہو رہی ہے۔ یعنی

فطرت کے مقاصد کی عیار اس کے ارادے
دنیا میں بھی میزان قیامت میں بھی میزان

اس طرح قوانینِ خداوندی کی اطاعت سے اس کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ

خیمہ در میدانِ الا اللہ زد است
در جہاں شاہد علی الناس آمد است

وہ ساری دنیا کے معبودانِ باطل سے منہ موڑ کر صرف ایک خدا کی حکومی اختیار کر لیتا ہے اور اس طرح ساری دنیا کی چوکھٹوں سے قلندرانہ بے نیاز گذر جاتا ہے۔ اس سرفرازی و سربلندی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ تمام اقوامِ عالم کے اعمال کا محاسب اور نگراں بن جاتا ہے۔ قرآن نے امت مسلمہ کی یہی خصوصیت بتائی ہے جب کہا ہے کہ وکذالک جعلناکم امۃ وسطا لتکونوا شہداء علی الناس۔ تمہیں ہم نے اس طرح ایک بین الاقوامی امت بنا دیا ہے کہ تم تمام نوع انسانی کے اعمال کے نگراں و محاسب بن کر رہو۔ یعنی یہ دیکھتے رہو کہ کون کونسی قوم زندگی کی صحیح شاہراہ پر چل رہی ہے اور کونسی اس سے ادھر ادھر ہٹتی ہے ویکون الرسول علیکم شہیدا۔ اور خود تمہارے اپنے اعمال پر تمہارا مرکز ملت نگراں و محاسب ہو۔

شاہد حالش نبیؐ انس و جاں
شاہدے صادق ترین شاہداں

امت مسلمہ کے اعمالِ حیات کی نگرانی کا فریضہ سب سے پہلے نبی اکرمؐ نے ادا کیا۔ حضورؐ وہ شاہد تھے جو دنیا بھر کے تمام شاہدین میں سب سے سچے تھے۔ اقوامِ عالم کا شاہد نگراں بننے کے لئے ضروری ہے کہ

قال را بگذار در بابِ حال زن
نورِ حق بر ظلمتِ اعمال زن

باتیں بنانا چھوڑ کر عمل کی طرف آجاؤ۔ اور اپنے اعمال کی تاریکیوں کو قوانینِ خداوندی کی روشنی میں پرکھتے چلے جاؤ۔ تاکہ معلوم ہوتا جائے کہ کہاں کہاں غلطی ہے اور کہاں کہاں کمزوری۔ اس طرح

در قبائے خسروی درویش زی
دیدہ بیدار و خدا اندیش زی

خلعتِ شاہانہ کے اندر درویشانہ زندگی بسر کرو۔ ایک عظیم مملکت تمہارے پاؤں کے نیچے ہو لیکن خود تمہارے اوپر قوانینِ الٰہی کا غلبہ ہو۔ تم نظامِ خداوندی کے ماتحت ہو اور ساری دنیا تمہاری ماتحت۔ اس طرح آنکھیں کھول کر اور ہر وقت قوانینِ خداوندی کو سامنے رکھ کر زندگی بسر کرو۔

ترب حق از ہر عمل مقصود دار
تا ز تو گردد جلالش آشکار

ہر عمل اور ہر کام سے تمہارا مقصود یہ ہو کہ تمہارے اندر صفاتِ خداوندی زیادہ سے زیادہ حد تک منعکس ہوتی جائیں۔ تمہاری زندگی قوانینِ الٰہیہ سے یک رنگ و ہم آہنگ ہوتی جائے۔ اور اس طرح خدا کا جلال۔ اس کے نظام کا غلبہ و تمکن۔ تمہارے اعمال سے آشکار ہوتا جائے۔ لیکن اس باب میں اس حقیقت کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھنا چاہیے کہ

صلح شر گردد چو مقصود است غیر
گر خدا باشد غرض، جنگ است خیر

اگر تمہاری سعی و کاوش سے مقصود یہ ہے کہ دنیا میں نظامِ خداوندی کا قیام ہو جائے۔ تاکہ انسانیت کو صحیح آزادی اور سرفرازی نصیب ہو جائے تو اس مقصد کے لئے جنگ بھی خیر ہو جائے گی۔ لیکن مقصد اس کے علاوہ کچھ اور ہو تو پھر جنگ تو ایک طرف، صلح بھی شر بن جائے گی۔

گر نہ گردد حق ز تیغِ ما بلند
جنگ باشد قوم را نا ارجمند

اگر ہماری تلوار سے حق کا قانون بلند نہیں ہوتا تو ہمارے لئے جنگ کبھی جائز قرار نہیں پا سکتی۔

حضرتِ شیخ میاں میر ولی
ہمسر خفی از نورِ جانِ او جلی

اس کے بعد علامہ اقبال لاہور میں مدفون، حضرت شیخ میاں میر اور شاہنشاہِ ہندوستان (اورنگزیب) کا ایک واقعہ بیان کرتے ہیں۔ واقعہ سے پہلے حضرتِ شیخ کی تعریف میں چار شعر لکھے ہیں۔ ایک اوپر گذر چکا ہے باقی تین یہ ہیں۔

بر طریقِ مصطفےٰ محکم پئے — نغمۂ عشق و محبت را نئے
تربتش ایمانِ خاکِ شہرما — مشعلِ نورِ ہدایت بہرما
بر درِ او جبہ فرسا آسماں — از مریدانش شہِ ہندوستاں

یہ تو رہا حضرت شیخ میاں میر کے متعلق۔ دوسری طرف شاہنشاہ تھا جس کی کیفیت یہ تھی کہ

شاہ تخمِ حرص در دل کاشتے — قصدِ تسخیرِ ممالک داشتے
از ہوس آتش بجاں افروختے — تیغ را اہلِ من مزید آموختے

بادشاہ کے دل میں حرص و ہوس کی تخم کاری ہو چکی تھی۔ وہ ملک گیری کے جذبہ میں سرشار تھا۔ وہ سلطنت پر سلطنت فتح کئے جاتا اور اس طرح اپنی مملکت کی وسعتیں بڑھائے چلا جاتا تھا۔ اس کی تلوار کی ہوسِ خون آشامی کی سیرابی ہی نہیں ہوتی تھی۔

در دکن ہنگامہ ہا بسیار بود
لشکرش در عرصہ پیکار بود

اس وقت دکن میں ایک ہنگامہ برپا تھا۔ اور اسے فرو کرنے کے لئے شہنشاہ کی فوجیں مصروفِ جنگ و قتال تھیں۔ اس حالت میں

رفت پیشِ شیخ گردوں پایۂ
تا بگیرد از دعا سرمایۂ

شاہنشاہ حضرت شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا تاکہ ان سے اپنی فتح و نصرت کے لئے دعائیں حاصل کرے۔ اس لئے کہ

مسلم از دنیا سوئے حق رم کند
از دعا تدبیر را محکم کند

مسلمان کا شیوہ یہ ہوتا ہے کہ وہ تمام مادی سامان و ذرائع جمع کر لینے کے بعد، تائید خداوندی کو پکارتا ہے اور اس طرح اپنی تدابیر کو ان قوتوں سے محکم تر کر لیتا ہے۔ مؤمن کی دعا سے مقصود اپنی اس آرزو کا اظہار ہوتا ہے کہ اس کا ہر قدم قانونِ خداوندی کے مطابق اٹھے۔ اور اس کا پاؤں اس جادۂ مستقیم سے ذرا بھی ادھر ادھر نہ ہٹنے پائے۔ ان آرزوؤں کے اظہار سے اس کے اندر ایک نفسیاتی قوت ابھرتی ہے اور اس کی تمام توجہات کو مقصدِ پیشِ نظر کے حصول پر مرکوز کر دیتی ہے (یہ اس واقعہ کے درمیان ایک ضمنی بات آ گئی تھی اصل واقعہ پھر

آگے چلتاہے)

شیخ از گفتارِ شہ خاموش ماند
بزمِ درویشاں سراپا گوش ماند

شیخ میاں میرؔ نے بادشاہ کی تمام باتیں سنیں، لیکن بالکل خاموش رہے۔ وہ بھی خاموش رہے اور ان کی وجہ سے یہ ساری بزمِ درویشاں بھی خاموش۔

تا مریدے سکۂ سیمیں بدست
لب کشود و مہرِ خاموشی شکست

اس خاموشی کو ایک مرید نے توڑا۔ اس کے ہاتھ میں چاندی کا ایک سکہ تھا۔ اس نے اسے حضرت شیخ کی خدمت میں پیش کیا اور کہا کہ

گفت ایں نذرِ حقیر از من پذیر
اے زحق آوارگاں را دستگیر
غوطہا زد در خوئے محنت تنم
تا گرہ زد درہمے را دامنم

یہ درہم میرے گاڑھے پسینے کی کمائی ہے۔ آپ اس نذرِ حقیر کو قبول فرمائیے۔

گفت شیخ ایں زر حقِ سلطان ماست
آنکہ در پیراہنِ شاہی گداست

یہ سن کر شیخ نے فرمایا کہ یہ درہم ہمارے بادشاہ کا حق ہے وہ بادشاہ جو اگرچہ خلعتِ خسروی میں ملبوس ہے۔ لیکن درحقیقت ایک گداگر، محتاج اور بھکاری ہے۔

حکمرانِ ماہ و مہر و انجم است
شاہِ ما مفلس ترینِ مردم است

اگرچہ اس کی مملکت کی وسعتیں حدود فراموش ہیں۔ لیکن یہ بچارا سب سے زیادہ مفلس انسان ہے۔

دیدہ بر خوانِ اجانب دوختہ است
آتشِ جوعش جہانے سوختہ است

اس کی مفلسی اور محتاجی کا یہ عالم ہے کہ اس نے اپنی آنکھیں ادھر اُدھر دوسروں کے دسترخوان پر جمار کھی ہیں کہ کہیں سے کوئی لقمہ مل جائے۔ اس کی بھوک کی آگ نے دنیا بھر کو خاکستر بنا دیا ہے۔

قحط و طاعون تابعِ شمشیر او
عالمے ویرانہ از تعمیرِ او

پہلے اس کی تلوار لوگوں کو فنا کے گھاٹ اتارتی ہے۔ اور اس کے بعد جو بچ جاتے ہیں۔ انھیں قحط اور وبائیں گھیر لیتی ہیں۔ اس طرح اس کی تعمیر کی آرزو کے ہاتھوں ایک دنیا ویرانہ ہوتی چلی جا رہی ہے۔

خلق در فریاد از نادارِیش
از تہیدستی۔ ضعیف آزارِیش

یہ اپنی محتاجی اور مفلسی کی وجہ سے ہر کمزور انسان کو ستاتا ہے اور اس سے ایک دنیا آہ و فغاں میں مصروف ہے۔

سطوتش اہلِ جہاں را دشمن است
نوعِ انساں کارواں این رہزن است

اس کی قوت و حشمت، شوکت و سطوت ساری دنیا کی دشمن ہے۔ یہ انسانیت کے قافلہ کو لوٹنے والا رہزن ہے۔

از خیالِ خود فریب و فکرِ خام
می کند تاراج را تسخیر نام

اس کی خود فریبی اور فکر کی ناپختگی کا یہ عالم ہے کہ یہ دنیا کو تباہ و برباد کر رہا ہے اور سمجھتا ہے کہ میں تسخیرِ کائنات کر رہا ہوں!

عسکرِ شاہی و افواجِ غنیم
ہر دو از شمشیرِ جوعِ او دو نیم

اس کی ہوس ملک گیری کے ہاتھوں دشمن کی فوجیں اور خود اپنے لشکر ٹکڑے ٹکڑے ہو رہے ہیں۔ اور یہ خوش ہے کہ میری فتوحات کا سلسلہ بڑھ رہا ہے۔

آتشِ جانِ گدا جوعِ گدا است
جوعِ سلطاں ملک و ملت را فناست

اگر کوئی گداگر، بھکاری بھوکا ہو تو اس کی بھوک کا عذاب خود اس کی اپنی جان پر پڑتا ہے۔ لیکن اگر کوئی بادشاہ ملک گیری کا بھوکا ہو جائے تو اس کی اس ہوس سے ملک اور ملت دونوں تباہ و برباد ہو جاتے ہیں۔

ہر کہ خنجر بہرِ غیر اللہ کشید
تیغِ او در سینۂ او آرمید

یاد رکھو! جس نے غیر اللہ کی خاطر تلوار اٹھائی۔ اس کی تلوار خود اس کے اپنے سینہ میں پیوست ہو گئی۔ تلوار ہمیشہ حق کی خاطر اٹھانی چاہیئے۔ نہ کہ ملک گیری کی خاطر۔

اس شعر پر اس باب کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

باسمہٖ تعالیٰ

میں تجھ کو بتاتا ہوں

تقدیرِ اُمم

کیا ہے؟

(محترم پرویز صاحب کا بصیرت افروز مقالہ جسے انھوں نے "سلیم کے نام خط"
کے دلکش انداز میں لکھا)

ادارۂ طلوعِ اسلام کراچی

سلیم کے نام

(قوموں کے عروج و زوال کا ابدی قانون)

نہیں سلیم! تاریخ کا علم اور اس کی اہمیت اس سے کہیں زیادہ وسیع اور اس سے کہیں زیادہ عمیق ہے۔ تاریخ محض ماضی کے واقعات اور حوادث کا ریکارڈ نہیں۔ وہ صرف اتنا بتلانے کے لئے نہیں کہ اکبر فلاں سال تخت پر بیٹھا اور فلاں سال مرگیا۔ وہ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ قومیں کس اصول کے ماتحت زندہ رہتی ہیں اور کس قانون کے ماتحت مرتی ہیں۔ وہ یہ بتاتی ہے کہ فلاں قوم نے اس قسم کی روشِ زندگی اختیار کی تو اس کا یہ نتیجہ نکلا اور فلاں قوم اس قسم کے نہج پر چلی تو اس کا انجام یہ ہوا۔ اسے سائنس آف ہسٹری یا فلسفۂ تاریخ کہتے ہیں۔ اور تم یہ سنکر متعجب ہوگے کہ تاریخ کو ایک سائنس یا فلسفہ کی حیثیت سے سب سے پہلے قرآن نے پیش کیا ہے۔ اس نے

سائنس آف ہسٹری

بتایا کہ قوموں کی موت اور حیات یونہی اتفاقی طور پر واقع نہیں ہو جاتی۔ ان کا عروج و زوال اندھا دھند طریق پر ظہور میں نہیں آجاتا۔ اس کے لئے خاص قانون اور اصول مقرر ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ بعض اوقات کوئی خاص قوم یا گروہ کچھ قوت جمع کر لیتا ہے۔ اور اس کے ذریعے وقتی طور پر اقتدار حاصل کر لیتا ہے۔ لیکن یہ ہنگامی حادثہ ہوتا ہے جو ایک شعلۂ مستعجل کی طرح فوراً ابھر کر خاموش ہو جاتا ہے۔ جسے قوموں کا عروج و زوال کہا جاتا ہے وہ ارتقائی طور پر نمودار ہوتا ہے اور اسی طرح تدریجی طور پر سمٹ کر پیچھے ہٹ جاتا ہے اور یہ سب کچھ ایک اٹل بندھے قانون کے مطابق ہوتا ہے۔

یہاں اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ جب ہم کسی قوم کی موت کا ذکر کرتے ہیں تو اس سے یہ مراد نہیں ہوتی کہ اس قوم کی نسل سطحِ ارض سے مٹ گئی۔ اس میں شبہ نہیں کہ بعض اوقات ایک نسل کی نسل طبعی طور پر (PHYSICALLY) دنیا سے مٹ جاتی ہے لیکن اکثر یہ ہوتا ہے کہ ایک قوم کے افراد طبعی طور پر زندہ رہتے ہیں (اور ان کی نسل بھی آگے چلتی رہتی ہے) لیکن اس قوم کا شمار زندہ اقوام میں نہیں ہوتا۔ اب سوال یہ سامنے آتا ہے کہ کسی قوم کی موت اور حیات سے مقصود کیا ہے؟ بات یہ ہے کہ

قوموں کی موت

ہر قوم ایک خاص نظریۂ حیات، ایک خاص تصورِ زندگی، ایک خاص نقطۂ نگاہ کی حامل ہوتی ہے۔ اس کے سامنے زندگی کا ایک خاص مقصود اور جد و جہد حیات کے لئے ایک خاص نصب العین ہوتا ہے۔ اس تصورِ حیات اور نظریۂ زندگی کو قرآن کی اصطلاح میں کلمہ اور دورِ حاضر کی اصطلاح میں (یوں سمجھو کہ) کلچر کہا جاتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ ہر قوم ایک خاص کلچر کی نمائندہ ہوتی ہے۔ لہذا ایک قوم کی موت سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ وہ جس کلچر کی حامی تھی اس میں اتنی صلاحیت نہیں تھی کہ وہ زمانہ کے تقاضات (CHALLENGES) کا مقابلہ کر سکے۔ اس مقام پر اس نقطہ کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ اگر ایک قوم کسی خاص نہ ہو

میں عرش پر ہے۔ اور اسکے بعد اس پر زوال آگیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ (۱) یا تو اس کلچر میں اتنی صلاحیت نہیں تھی کہ وہ زمانہ کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے سامنے ٹھہر سکتا اور یا (۲) یہ کہ اس قوم نے اُس پہلے کلچر کو چھوڑ کر کوئی اور کلچر اختیار کر لیا تھا جس میں زندہ رہنے اور آگے بڑھنے کی صلاحیت نہیں تھی۔ مختصراً یوں سمجھو کہ جس وقت کوئی قوم زوال پذیر ہوتی ہے اُس وقت وہ کسی ایسے کلچر کی حامل ہوتی ہے جس میں زمانے کے تقاضوں کا مقابلہ کرنے کے لئے صلاحیت نہیں ہوتی۔

اس کے معنی یہ ہوئے کہ دنیا میں کلچر اور زمانہ کے تقاضوں میں مسلسل کشمکش جاری رہتی ہے۔ جب تک ایک کلچر ان تقاضوں کا مقابلہ کرتا رہتا ہے اس کی حامل قوم زندہ رہتی ہے۔ جب زمانے کے تقاضے اس پر غالب آجاتے ہیں تو وہ قوم مصافِ زندگی میں پچھڑ جاتی ہے۔ اور اس کی جگہ وہ قوم لے لیتی ہے جو ایسے کلچر کی حامل ہوتی ہے۔ جس میں ان تقاضوں کے سامنے ٹھہرنے کی سکت ہوتی ہے۔ اس قانون کو قرآن کی اصطلاح میں قانون استبدال و استخلافِ قومی (LAW OF SUBSTITUTION AND SUCCESSION OF NATIONS) کہا جاتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ جس طرح دنیا میں کوئی فرد مرنا نہیں چاہتا۔ اسی طرح کوئی قوم بھی مرنا نہیں چاہتی۔ وہ ہمیشہ زندہ اور برسرِ اقتدار رہنا چاہتی ہے۔ لیکن جس طرح کوئی فرد محض اس لئے زندہ نہیں رہ سکتا کہ اسے زندہ رہنے کی آرزو ہے۔ اسے زندہ رہنے کے لئے قانونِ حیات کے مطابق چلنا ضروری ہے۔ اسی طرح کوئی قوم بھی محض مقدس آرزوؤں اور حسین تمناؤں کے بل بوتے پر زندہ نہیں رہ سکتی۔ اُسے زندہ رہنے کے لئے اس اٹل قانون کی اتباع کرنی ہوگی جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ چنانچہ جب (صدرِ اول کے) مسلمانوں کا مقابلہ ان قوموں کے ساتھ ہوا جو ایسے کلچر کی حامل تھیں جن میں آگے چلنے کی صلاحیت نہیں رہی تھی (انھیں اہل کتاب کہہ کر پکارا گیا ہے) تو قرآن نے انھیں واضح الفاظ میں بتا دیا کہ یہ ٹھیک ہے کہ تم میں سے ہر فریق کی یہ دلی آرزو ہے کہ وہ اس کشمکش میں غالب آئے اور آگے بڑھ جائے۔ لیکن یاد رکھو۔ اس بات کا فیصلہ محض آرزوؤں پر مبنی نہیں۔ لَيْسَ بِأَمَانِيِّكُمْ وَلَا أَمَانِيِّ أَهْلِ الْكِتَابِ۔ اس کا فیصلہ نہ تو تمہاری آرزوؤں کے مطابق ہوگا اور نہ ہی تمہارے فریق مقابل (اہل کتاب) کی آرزوؤں کے مطابق۔ اس کا فیصلہ اس اٹل قانون کے مطابق ہوگا کہ مَنْ يَعْمَلْ سُوءًا يُجْزَ بِهٖ۔ جو قوم بھی ناہمواریاں پیدا کرنے والے پروگرام پر عمل پیرا ہوگی۔ اُس کی اِس روش کے تباہ کن نتائج اس کے سامنے آکر رہیں گے وَلَا يَجِدْ لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا (۴/۱۲۳) اور ان نتائج و عواقب سے انھیں کوئی نہیں بچا سکے گا۔ بجز اس کے کہ وہ قانونِ خداوندی ہی کو اپنی مدافعت کے لئے سپر بنائیں۔ یہ اسلئے کہ کائنات میں لاقانونیت (LAWLESSNESS) اور دھاندلی نہیں۔ یہاں زندگی اور موت کا فیصلہ قاعدے اور قانون کے مطابق علیٰ وجہ البصیرت ہوتا ہے لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ (۸/۴۲) جسے ہلاک ہونا ہے وہ بھی دلائل و براہین کی رو سے ہلاک ہو۔ اور جسے زندہ رہنا ہے وہ بھی دلائل و براہین کی رو سے زندہ رہے۔ یہاں نہ کسی کو زندگی مراعاتِ خسروانہ (بادشاہوں کی بخشش کے طور پر ملتی ہے۔ نہ کسی کی موت انتقامِ شاہانہ (بادشاہوں کی برہمیٔ مزاج) کی وجہ سے ہوتی ہے۔ یہاں ہر بات کے لئے قاعدہ اور قانون مقرر ہے جس میں کسی کے لئے کوئی استثنا نہیں ہوتی۔

قانون کی حکومت

اس تمہید کے بعد سلیم! آگے بڑھو۔ نظریاتِ زندگی کی باہمی کشمکش کے متعلق ہمارے زمانہ میں ہیگل نے ایک فلسفہ پیش کیا جسے فلسفۂ تضادات کہتے ہیں۔ اس نے کہا کہ ایک نظریہ (IDEA) پیدا ہوتا ہے۔ وہ بڑھتا۔ پھولتا۔ پھلتا ہے جب وہ شباب پر پہنچ جاتا ہے تو اس کے اندر سے ایک اور نظریہ اُبھرتا ہے جو پہلے نظریہ کی ضد ہوتا ہے۔

ہیگل کا فلسفہ

اب وہ سابقہ نظریہ مضمحل ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ اور یہ نیا نظریہ پروان چڑھنے لگتا ہے۔ آہستہ آہستہ وہ پہلا نظریہ محو ہو جاتا ہے اور اس کی جگہ یہ نیا نظریہ لے لیتا ہے۔ یہ نیا نظریہ اسی طرح بڑھتا۔ پھولتا۔ پھلتا ہے اور پھر اس کے اندر سے ایک نیا نظریہ ابھرتا ہے جو اس کی ضد ہوتا ہے۔ ہیگل کا کہنا ہے کہ نظریات کی یہ گردش دولابی (کہ ایک آتا ہے، ایک جاتا ہے) مسلسل اور پیہم جاری ہے ہر ابھرنے والے نظریہ کو کچھ وقت کے بعد مضمحل ہونا اور دوسرے نظریہ کے لئے جگہ خالی کرنی پڑتی ہے۔

ہیگل کے بعد مارکس آیا۔ اس نے بھی ہیگل ہی کے فلسفہ کی اتباع کی لیکن اس فرق کے ساتھ کہ مارکس نے کہا کہ یہ کشمکش نظریات (IDEAS) میں نہیں ہوتی بلکہ نظامہائے حیات (SYSTEMS) میں ہوتی ہے ایک دور میں زندگی کا ایک نظام (مثلاً نظامِ سرمایہ داری) کارفرما ہوتا ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد اس کے اندر سے ایک اور نظام پھوٹتا ہے۔ جو اس پہلے نظام کی ضد ہوتا ہے۔ یہ نظام اس سابقہ نظام کی جگہ لے لیتا ہے۔ اور اس طرح یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اس فلسفہ کو DIALECTICS کہتے ہیں۔ یہ کشمکش۔ تصورات (IDEAS) میں ہو یا نظامہائے حیات (SYSTEMS) میں ایک چیز دونوں میں مشترک ہے۔ اور وہ یہ کہ (اس فلسفہ کی رُو سے) کوئی تصور یا نظام نہ ذاتی طور پر اچھا ہوتا ہے نہ بُرا۔ نہ ایک کو دوسرے پر کوئی فضیلت ہوتی ہے نہ فوقیت۔ یا یوں کہو کہ کسی تصور یا نظام میں ذاتی طور پر اس کی صلاحیت نہیں ہوتی کہ وہ ہمیشہ کے لئے باقی رہ سکے یا اپنے متضاد نظریہ یا نظام پر ہمیشہ غالب رہ سکے۔ (غالب کے الفاظ میں) ہر نظریہ اور ہر نظام کی بنیاد میں خرابی کی صورت مضمر ہوتی ہے۔ وہ اپنے سے پہلے نظریہ یا نظام کی جگہ لیتا ہے۔ کچھ عرصہ تک اس کا دور دورہ رہتا ہے اور اس کے بعد یہ کہہ کر ختم ہو جاتا ہے کہ

مارکس کا فلسفہ

میں اسی لئے بنا تھا کہ خدا مجھے بگاڑے

ہیگل اور مارکس کا خیال ہے کہ قوموں کی موت و حیات کا سلسلہ اسی طرح جاری رہتا ہے۔ یہی وہ چکر ہے جس کے مطابق کلچرز بنتے اور جلتے ہیں۔ نہ کوئی کلچر بنیادی طور پر فنا آمادہ ہوتا ہے نہ بقا در آغوش۔ ہر ایک کی موت کا ایک دن مقرر ہوتا ہے۔ اسے نہ کوئی اس سے ایک دن زیادہ زندہ رکھ سکتا ہے۔ نہ اس سے ایک دن پہلے مار سکتا ہے۔

اس کے برعکس قرآن بھی کلچرز کے محو و ثبات کا ایک فلسفہ پیش کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہاں تک تو بات ٹھیک ہے کہ دنیا میں متضاد نظریات کی کشمکش جاری ہے۔ لیکن یہ صحیح نہیں کہ سب نظریے ایک ہی قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک نظریہ ایسا ہوتا ہے جس میں بنیادی طور پر غالب آنے اور آگے بڑھنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ اور اس کے برعکس دوسرا نظریہ وہ ہوتا ہے جس میں بنیادی طور پر اس کی صلاحیت ہی نہیں ہوتی۔ وہ اول الذکر نظریہ کو حق کہہ کر پکارتا ہے۔ اور ثانی الذکر کو باطل

قرآن کا فلسفہ

سے تعبیر کرتا ہے۔ قرآن کا خدا کہتا ہے کہ ہم اپنے کائناتی قانون سے کرتے یہ ہیں کہ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ۔ حق کو باطل پر مارتے رہتے ہیں۔ ان کی باہم کشمکش رہتی ہے فَيَدْمَغُهُ اس کشمکش کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حق اس باطل کا بھیجا توڑ دیتا ہے۔ اس کا کچومر نکال دیتا ہے فَإِذَا هُوَ زَاهِقٌ (۲۱/۱۸) اور وہ (باطل) بری طرح شکست کھا کر بھاگ جاتا ہے۔ اس لئے کہ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا (۱۷/۸۱)، باطل کی بنیاد میں خرابی کی صورت مضمر ہوتی ہے۔ وہ حق کے مقابلے میں ٹھہر ہی نہیں سکتا۔ وہ بنا ہی ایسا ہے کہ جب حق کے سامنے آئے منہ موڑ کر بھاگ جائے۔ لہٰذا جو قوم حق کے کلچر کی حامل ہوگی۔ وہ ہمیشہ اس قوم پر غالب رہے گی جو باطل کے کلچر کی نمائندہ ہوگی۔ اور اس وقت تک غالب رہے گی جب تک وہ حق پر قائم ہے۔ یہ نہیں ہوگا کہ حق کا کلچر کچھ وقت کے بعد خود بخود مرجھا کر گر پڑے۔ اور باطل کا کلچر اسکی جگہ لے لے۔ یہ ہو نہیں سکتا کہ حق کی حامل قوم پر وہ قوم غالب آجائے جو اس کلچر کے صحیح ہونے پر ایمان نہیں رکھتی۔ وَلَنْ يَجْعَلَ اللَّهُ لِلْكَافِرِينَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ سَبِيلًا (۴/۱۴۱)

حق و باطل حق اور باطل کی قرآنی اصطلاحات کا مفہوم کیا ہے۔ اس کے متعلق میں تمہیں اس سے پہلے کئی بار بتا چکا ہوں۔ مختصر الفاظ میں اسے دہرا دوں کہ حق اس نظریہ (کلمہ) کا نام ہے جو انسانیت کی بلند اور مستقل اقدار (PERMANENT VALUES) کا حامل ہے جو حقیقت (REALITY) پر مبنی ہے۔ جس کے نتائج ہمیشہ تعمیری (CONSTRUCTIVE) ہوتے ہیں جس کے سہارے کائنات کی ہر شے اپنے ارتقائی مراحل طے کرتی، ابھرتی اور بلند ہوتی چلی جاتی ہے۔ یہ حق ہے اور جو کچھ اس کی ضد ہے وہ باطل ہے۔ یعنی تخریبی نتائج کا حامل نظریۂ زندگی۔

تم نے غور کیا سلیم! کہ قرآن نے تصورات حیات یا نظامہائے زندگی یا کلچرز کی کشمکش کا جو فلسفہ پیش کیا ہے وہ ہیگل یا مارکس کے فلسفہ کے کس قدر خلاف ہے؟ (یہی وہ بنیادی اختلاف ہے جو اسلام کو کمیونزم کی ضد قرار دیتا ہے) وہ کہتا ہے کہ قوموں کی حیات و موت کے فیصلے اس فلسفہ اور اس قانون کی رو سے ہوتے ہیں۔ یہی کلچرز کے محرکات کا معیار ہے۔ قرآن نے اقوام سابقہ کی جس قدر داستانیں (یعنی تاریخی یادداشتیں) پیش کی ہیں۔ ان سے مقصود یہی یہ بتانا ہے کہ فلاں قوم نے حق کی روشن اختیار کی تو وہ کس طرح اس قوم پر غالب آگئی جو باطل پر روش تھی۔ اور جب اس قوم نے جو حق پر تھی، حق کی روش کو چھوڑ دیا تو وہ کس طرح ذلیل و خوار ہوگئی۔ اس وقت مجھے اس کی فرصت نہیں سلیم! کہ میں ان تمام تاریخی نوشتوں کو اس نقطۂ نگاہ سے سامنے لاکر تمہیں بتاؤں کہ قرآن نے تاریخ کو کس طرح ایک سائنس اور فلسفہ کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ کبھی فرصت ملی تو یہ بھی ہو جائے گا۔ اس وقت میں صرف وہ چند ایک مقامات تمہارے سامنے لاسکوں گا جن میں قرآن نے اپنے اس اصولی قانون کی مختلف انداز سے وضاحت کی ہے۔ یا یوں کہو کہ جن میں وہ اس اصل الاصول کے مختلف گوشوں (FACETS) کو سامنے لایا ہے۔ ان مقامات میں اس نے وضاحت سے بتایا ہے کہ قوموں کے استبدال و استخلاف کے قوانین کیا ہیں؟ کون سی قومیں مٹتی ہیں۔ اور کونسی ان کی جگہ لیتی ہیں۔ ذرا غور سے سنو کہ یہ حقائق ایسے نہیں جنہیں سطحی طور پر دیکھ کر انسان آگے بڑھ جائے۔ ان کا تعلق خود ہماری (اجتماعی) موت اور حیات سے ہے۔ اور انہی مقامات سے یہ حقیقت بھی سامنے آجائے گی کہ خود مسلمانوں کے زوال کے اسباب کیا ہیں اور

ان کی بازآفرینی کی صورت کیا۔ وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم۔

حیوانی سطح کی زندگی

سب سے پہلے قرآن یہ کہتا ہے کہ جو کلچر انسانی زندگی کو حیوانی سطح (ANIMAL LEVEL) ہی پر رکھتا ہے اسے کبھی ثبات و بقا نصیب نہیں ہو سکتی۔ وہ کلچر باطل کا حامل ہے۔ قرآن کی رُو سے انسان اور حیوان میں اتنا ہی فرق نہیں کہ انسان سلسلۂ ارتقاء میں حیوان سے اگلی کڑی ہے۔ وہ یہ کہتا ہے کہ انسان کی سطح پر پہنچ کر زندگی ایسے نئے امتیازات کی حامل ہو جاتی ہے جو حیوانی سطح پر قطعاً موجود نہیں ہوتے۔ انہی امتیازات کا نام شرف انسانیت ہے اور انہی کی نشوونما مقصودِ حیات۔ ہمارے دور میں اس نظریہ زندگی کو جو انسانی زندگی کو محض حیوانی زندگی کی ایک بڑھی ہوئی شکل قرار دیتا ہے۔ مادی نظریۂ زندگی یعنی (MATERIALISTIC CONCEPT OF LIFE) کی اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ اس نظریہ کی حامل قومیں خواہ کتنی ہی قوت اور سازوسامان کیوں نہ جمع کر لیں۔ کامیابی سے کامران نہیں ہو سکتیں۔ سورۂ محمد میں ہے اَفَلَمْ یَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَیَنْظُرُوْا کَیْفَ کَانَ عَاقِبَۃُ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ۔ کیا ان لوگوں نے دنیا میں چل پھر کر دیکھا نہیں کہ ان قوموں کا انجام کیا ہوا جو ان سے پہلے گذر چکی ہیں؟ تم نے دیکھا سلیم! قرآن تاریخی نوشتوں کے مطالعہ پر کس قدر زور دیتا ہے اور اس مطالعہ کو کس طرح ایک سائنس کی حیثیت دیتا ہے۔ یعنی اس نے آگے چل کر جو اصول بیان کرنا ہے۔ اس کی صداقت کے لئے وہ اقوام سابقہ کی تاریخ کو بطور شہادت پیش کرتا ہے ان اقوام کے متعلق وہ کہتا ہے کہ دَمَّرَ اللّٰہُ عَلَیْھِمْ۔ قانونِ خداوندی نے انہیں تباہ و برباد کر دیا اس کے بعد ہے وَلِلْکَافِرِیْنَ اَمْثَالُھَا۔ اقوام سابقہ کی جس تباہی و بربادی کا ذکر کیا گیا ہے اسکے متعلق یہ نہیں سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ محض ماضی کی داستانیں ہیں۔ جنہیں قصے کہانیوں کی طرح دہرایا جا رہا ہے۔ اور ہم سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ یہ چیز بطور اصول بیان کی جا رہی ہے کہ جن اقوام نے حق کی روش سے انکار کیا۔ ان کا حشر یہ ہوا۔ لہٰذا اب بھی جو قوم اس قسم کی روش اختیار کرے گی۔ اس کا انجام ایسا ہی ہوگا۔ ذٰلِکَ بِاَنَّ اللّٰہَ مَوْلَی الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَاَنَّ الْکَافِرِیْنَ لَا مَوْلٰی لَھُمْ یہ اس لئے ہے کہ کائنات میں جو کچھ ہوتا ہے دھاندلی سے نہیں ہوتا۔ یہاں سب کچھ قاعدے اور قانون کے مطابق ہوتا ہے سو جو قوم خدا کے مقرر کردہ قانون کے مطابق زندگی بسر کرتی ہے۔ اُس کی اس روش کے نتائج اُس کے پشت پناہ بن جاتے ہیں لیکن جو قوم اس قانون سے انکار کر کے کوئی دوسری روش اختیار کرتی ہے تو اس کا محافظ و کارساز کوئی نہیں ہو سکتا۔ یہ ایک حکم اصول ہے جو شروع سے چلا آتا ہے اور آج بھی اسی طرح کارفرما ہے۔ اسی اصول کے مطابق اِنَّ اللّٰہَ یُدْخِلُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ۔ جو لوگ اس قانون کی صداقت پر یقین رکھتے ہیں اور اسکے متعین کردہ صلاحیت بخش پروگرام پر عمل پیرا ہوتے ہیں وہ شادکامیوں اور کامرانیوں کی صدا بہار جنتی زندگی بسر کرتے ہیں۔ اس کے برعکس وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا یَتَمَتَّعُوْنَ وَیَاْکُلُوْنَ کَمَا تَاْکُلُ الْاَنْعَامُ وَالنَّارُ مَثْوًی لَّھُمْ۔ جو لوگ اس قانون کی

صداقت سے انکار کرتے ہیں۔ ان کی زندگی حیوانی سطح پر ہوتی ہے۔ جس میں مقصودِ حیات کھانا، پینا اور طبعی زندگی پوری کر کے مر جانا ہوتا ہے۔ اس روش زندگی اور نظریۂ حیات کا انجام تباہی اور بربادی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ ان لوگوں کا خیال یہ ہوتا ہے کہ اگر ہم بہت سی قوت اور جمعیت اکٹھی کر لیں گے تو ہمارا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ یہ اُن کی خام خیالی ہے انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ هِيَ اَشَدُّ قُوَّةً مِّنْ قَرْيَتِكَ الَّتِيْٓ اَخْرَجَتْكَ اَهْلَكْنٰهُمْ فَلَا نَاصِرَ لَهُمْ (۴۷/۱۳) کتنی ہی قومیں ان سے پہلے ایسی گذر چکی ہیں۔ جن کے پاس اِن (موجودہ لوگوں سے جنھوں نے اے رسول! تجھے تیرے وطن سے نکال دیا ہے کہیں زیادہ) قوت تھی۔ ہمارے قانونِ مکافات نے انھیں ہلاک کر دیا اور ان کا کوئی ایسا حامی و مددگار نہ نکلا جو انھیں اس تباہی سے بچا سکتا۔ سو جب اُن کا حشر یہ ہوا تو ان کا انجام بھی ایسا ہی ہوگا۔ یہ ہو نہیں سکتا کہ غلط روش سابقہ زمانہ میں تو تباہی و بربادی پر منتج ہو اور وہی روش اس زمانہ میں کامیابی و کامرانی عطا کر دے۔

اس سے ہم نے دیکھ لیا سلیم! کہ جس تصورات حیات کی رو سے یہ سمجھ لیا جائے کہ انسانی زندگی محض حیوانوں کی طرح طبعی زندگی ہے اور اسکے سامنے خورد و نوش سے بلند کوئی مقصد نہیں۔ اس تصور (کلچر) کو بقا اور دوام نصیب نہیں ہو سکتا اور جو معاشرہ ان خطوط پر تشکل ہو۔ ان میں انسان کبھی امن و سکون کی زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ انسانی سطح پر زندگی کے معنی یہ ہیں کہ انسان کے سامنے زندگی کے مستقل اقدار ہوں۔ اور ان کا حصول اس کا نصب العین حیات۔ یہی وہ اقدار ہیں جن کے حصول سے انسان طبعی موت سے بھی مر نہیں سکتا بلکہ حیاتِ جاوید حاصل کر سکتا ہے۔

اب آگے بڑھو۔ قرآن نے دوسرا اصول یہ بتایا ہے کہ جس نظام میں حالت یہ ہو کہ معاشرہ میں نچلا طبقہ دن رات محنت کر کے پیدا کرے۔ اور اوپر کا طبقہ ان کی محنت پر مُفت میں عیش اڑائے۔ وہ نظام کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا

مترفین کی نظریۂ زندگی

حق پر مبنی نظام میں کبھی یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک (محنت کش) طبقہ کے خون کی رنگینی دوسرے (بیکار) طبقہ کی عشرت گاہوں کی تزئین و آرائش میں صرف ہو۔ سورۂ انبیاء میں ہے وَكَمْ قَصَمْنَا مِنْ قَرْيَةٍ كَانَتْ ظَالِمَةً وَّاَنْشَاْنَا بَعْدَهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ۔ کتنی ہی قومیں ایسی گذری ہیں کہ ہمارے قانونِ مکافات نے انھیں ان کی زیادتیوں کی وجہ سے تباہ کر دیا۔ اور ان کی جگہ اور قوموں نے لے لی۔ چنانچہ ان کے ساتھ ہوا یہ کہ فَلَمَّآ اَحَسُّوْا بَاْسَنَآ اِذَا هُمْ مِّنْهَا يَرْكُضُوْنَ۔ جب انھوں نے محسوس کیا (یعنی اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا) کہ ہمارا عذاب سامنے آ رہا ہے تو وہ اس سے بھاگنے لگے۔

موضوع کے تسلسل کا تقاضا ہے کہ اس سے اگلی آیت فوراً سامنے لے آئی جائے۔ لیکن اس آیت میں سلیم! ایک نکتہ ایسا آگیا ہے۔ جس کی وضاحت کے بغیر آگے بڑھنے کو جی نہیں چاہتا۔ غور سے سنو۔ آیت میں ہے فَلَمَّآ اَحَسُّوْا بَاْسَنَآ۔ جب انھوں نے محسوس کر لیا کہ ہمارا عذاب آ رہا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارا عذاب تو بہت پہلے سے آ رہا تھا لیکن وہ ابھی محسوس شکل میں ان کے سامنے نمودار نہیں ہوا تھا۔ وہ ان کے حواس (SENSE PERCEPTION) کی زد میں نہیں آیا تھا۔ وہ ابھی غیر مرئی شکل میں مرتب ہو رہا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ ہر عمل کا نتیجہ اسی وقت مرتب ہونا شروع ہو جاتا ہے جب وہ عمل سرزد ہو۔ لیکن یہ نتیجہ اپنے ابتدائی مراحل میں غیر محسوس اور غیر مرئی ہوتا ہے اور انسان سمجھتا نہیں کہ اسکے عمل کا نتیجہ مرتب ہو رہا ہے۔ یہ بات اسکی سمجھ میں اس وقت آتی ہے۔ جب وہ نتیجہ محسوس شکل میں سامنے آجاتا ہے۔ عمل کے ارتکاب اور اسکے نتیجے کے محسوس شکل میں سامنے آنے کے درمیانی وقفہ کو اجل یا میعاد کہتے ہیں۔ اس کو مہلت کا وقفہ بھی کہا جاتا ہے (اسکی پوری تشریح ذرا آگے چل کر آئے گی) غلط نظام کی حامل قومیں، اپنی عقل و فکر اور تدبر و سیاست کی رُو سے ان تمام دروازوں، کھڑکیوں، روشندانوں اور رخنوں کو بند کر لیتی ہیں جن کے راستے (وہ سمجھتی ہیں کہ) بربادی آسکتی ہے اور جب اس طرح سے بربادی فوراً سامنے نہیں آتی تو وہ مطمئن ہو جاتی ہیں کہ ہمارا انتظام بڑا محکم اور (FOOL-PROOF) ہے۔ لیکن خدا کا قانون ان کی غلط روش کے تباہ کن نتائج کو آہستہ آہستہ تدریجاً ان راستوں سے لے آتا ہے جو ان کے فہم و شعور میں بھی نہیں آسکتے۔ (سَنَسْتَدْرِجُهُم مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُونَ ۱۸۲ / ۷) اور وہ اسے اُس وقت دیکھ پاتے ہیں۔ جب وہ محسوس شکل میں ان کے سامنے آکھڑا ہوتا ہے۔ یہ مطلب ہے فَلَمَّا أَحَسُّوا بَأْسَنَا کا۔

بہر حال قرآن کہہ یہ رہا تھا کہ جب ان لوگوں کے سامنے ہمارا عذاب محسوس شکل میں آگیا تو وہ لگے بھاگنے۔ لیکن ہمارے قانونِ مکافات نے انھیں آواز دی کہ لَا تَرْكُضُوا مت بھاگو۔ کھڑے ہو جاؤ۔ رکو۔ تھمو۔ تم بھاگ کر جا کہاں رہے ہو؟ وَارْجِعُوا إِلَىٰ مَا أُتْرِفْتُمْ فِيهِ وَمَسَاكِنِكُمْ۔ رکو اور لوٹ کر وہیں چلو جہاں تم نے اپنے عیش و عشرت کے سامان جمع کر رکھے تھے۔ اور غریبوں کی کمائی سے بڑے بڑے ذی شان محلات تعمیر کر رکھے تھے۔ چلو لوٹ کر وہیں چلو لَعَلَّكُمْ تُسْأَلُونَ تاکہ تم سے پوچھا جائے کہ

تاکہ تم سے پوچھا جائے

تم نے یہ چیزیں دوسروں کی کمائی سے کیسے بنا لیں؟ تمہیں اس کا حق کیسے پہنچتا تھا؟

اس نکتے پر ذرا غور کر و سلیم! کہ قرآن نے کیا بات کہہ دی ہے۔ غلط نظام میں اوپر کا طبقہ سمجھتا ہے کہ ہم جو کچھ بھی چاہے کریں ہمیں کوئی پوچھنے والا نہیں۔ اول تو وہ اپنے آپ کو قانون کی زد سے باہر سمجھتے ہیں۔ وہ ایسی تدابیر اختیار کرتے رہتے ہیں جن سے وہ قانون کی گرفت میں آہی نہ سکیں۔ اور اگر کہیں ایسا ممکن نہ ہو تو وہ قانون ہی ایسا بنا لیتے ہیں جس کی رُو سے وہ سب کچھ جائز قرار پا جائے جو کچھ وہ کرتے ہیں (الَّذِينَ يَبْخَلُونَ وَيَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ ۲۴ / ۵۷) چنانچہ نظام سرمایہ داری میں یہی کچھ ہوتا ہے کہ اوپر کا طبقہ اس قسم کے قوانین بنا لیتا ہے کہ وسائل پیداوار پر انفرادی ملکیت بے حد و نہایت (UN-LIMITED) جائز ہے۔ دوسری طرف وہ اربابِ شریعت کو اپنے ساتھ ملا لیتا ہے اور وہ فتوے دے دیتے ہیں کہ اس قسم کی ذاتی ملکیت پر حد بندی عائد کرنا مداخلت فی الدین ہے۔ اس طرح یہ سب کچھ قانوناً اور شرعاً جائز قرار پا جاتا ہے۔ اور اس کے متعلق ان سے کچھ پوچھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن قرآن کہتا ہے کہ ان حیلوں اور بہانوں ان روباہ بازیوں اور دسیسہ کاریوں۔ ان خدا فریبیوں اور خود فراموشیوں سے تم خدا کے قانونِ مکافات کی گرفت سے نہیں بچ سکتے۔ ان سے تم اس خطرے سے محفوظ نہیں ہو سکتے کہ اگر کسی نے پوچھ لیا تو اس کا کیا جواب دیں گے۔ خدا کا قانون تو پائی پائی کا حساب لے لے گا۔ جب تم جہنم کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لو گے۔ (لَتَرَوُنَّ الْجَحِيمَ) تو اس وقت لَتُسْأَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيمِ (۱۰۲ / ۸) تم سے ہر نعمت کے متعلق پوچھا جائے گا کہ وہ

کیسے حاصل کی گئی تھی اور کہاں صرف ہوئی تھی۔

اس وضاحت کے بعد پھر اصل آیت کی طرف لوٹو۔ قرآن کہتا ہے کہ جب ان قوموں کی طرف تباہی کا عذاب آیا۔ اور وہ اسے دیکھ کر بھاگنے لگے تو ہمارے قانون نے انہیں للکارا اور کہا کہ رک جاؤ۔ اور لوٹ کر اپنے عشرت کدوں کی طرف چلو تاکہ تم سے پوچھا جائے کہ ان پر تمہارا کیا حق تھا۔ اس کے بعد ہے کہ قَالُوْا یٰوَیْلَنَآ اِنَّا کُنَّا ظٰلِمِیْنَ۔ اس کے جواب میں انہوں نے زبانِ حال کہا کہ حقیقت یہ ہے کہ ہم واقعی زیادتی کیا کرتے تھے۔ دوسرے کے حق پر غاصبانہ قبضہ جما لیا کرتے تھے۔ اور یہ تباہی اسی وجہ سے آئی ہے۔ فَمَا زَالَتْ تِّلْکَ دَعْوٰىهُمْ حَتّٰى جَعَلْنٰهُمْ حَصِیْدًا خٰمِدِیْنَ۔ لیکن اس وقت ان کے اس اعتراف اور اقرار سے کچھ حاصل نہ ہوا۔ وہ یہ کہتے رہے۔ اور ہمارا قانون انہیں تباہ و برباد کرتا رہا تا آنکہ وہ ایسے ہو گئے جیسے کوئی کٹا ہوا کھیت یا بجھا ہوا انگارہ ہو۔

اس کے بعد سلیم! قرآن ایک ایسی بات کہتا ہے جو فکر و نظر کی پوری کائنات کو اپنی طرف مرکوز کر لیتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ کچھ یونہی ہنگامی طور پر نہیں ہوتا۔ بلکہ ہمارے قانونِ مکافات کی رو سے ہوتا ہے جسے نتیجہ خیز بنانے کے لئے یہ ساری کی کائنات مصروفِ گردش ہے وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَا لٰعِبِیْنَ (۲۱/۱۶) یہ کائنات یہ ارض و سما کا سلسلہ ہم نے یونہی کھیل تماشہ کے طور پر نہیں بنا دیا۔ یہ عظیم کارگہ ایک خاص مقصد کے لئے مصروفِ تگ و تاز ہے اور وہ مقصد یہ ہے کہ دنیا میں کوئی عمل اپنا نتیجہ مرتب کئے بغیر نہ رہ سکے۔ اور اس کے ایک آیت بعد وہ آیت ہے جسے پہلے بھی درج کیا جا چکا ہے یعنی بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَیَدْمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ (۲۱/۱۸) یہ سلسلہ کائنات اس لئے سرگرمِ عمل ہے کہ حق و باطل کی کشمکش میں حق غالب رہے اور باطل کا سر کچلا جائے۔ لہٰذا قوموں کے عروج و زوال کے لئے جو قانون ہم نے مقرر کیا ہے۔ وہ نتیجہ خیز ہو کر رہتا ہے۔ اس کے راستے میں کوئی قوت مزاحم نہیں ہو سکتی۔

تم نے غور کیا سلیم! کہ قرآن نے قوموں کی تباہی اور بربادی کے متعلق دوسرا اصول کیا بیان کیا ہے؟ اس نے کہا ہے کہ جس نظام کی رو سے ایک طبقہ دوسرے طبقہ کی محنت پر عیش کی زندگی بسر کرے، وہ نظام کبھی دیرپا نہیں ہو سکتا۔

جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے … تدبر کی فسوں سازی سے قائم رہ نہیں سکتا

اب اور آگے بڑھو۔ نظامِ سرمایہ داری کا ایک پہلو تو یہ ہے کہ ایک طبقہ محنت کرتا ہے اور دوسرا طبقہ ان کی محنت پر مفت میں عیش اڑاتا ہے۔

دانہ ایں می کارد و آں حاصل برد … لُقمہ برا اُستے دیگر چرد

اور اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ ایک طبقہ دولت کو سمیٹ کر اپنے لئے مخصوص کئے جاتا ہے اور اسے نوعِ انسانی کی نشو و نما کیلئے کھلا نہیں رکھتا۔

دولت سمیٹنے والے — قرآن کی اصطلاح میں اسے بخل کہتے ہیں۔ قرآن کا کہنا ہے کہ جو نظام بخل کے نظریہ کو دلیلِ راہ بنائے اسکی حامل قوم کبھی زندہ و پائندہ نہیں رہ سکتی، اسے مٹا دیا جاتا ہے اور اس کی جگہ دوسری قوم لے لیتی ہے۔ سورۂ محمد میں ہے۔

هَآ أَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تُدْعَوْنَ لِتُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَمِنْكُمْ مَّنْ يَّبْخَلُ. سن رکھو کہ تمہاری کیفیت کیا ہے؟ تم وہ لوگ ہو کہ تمہیں کہا جاتا ہے کہ تم اپنا نظام ایسا رکھو جسمیں تمہاری محنت کا ماحصل نوعِ انسانی کی فلاح و بہبود کے لئے اس طرح کھلا رہے کہ تم اس کے معاوضے میں کسی سے کچھ لینے کے طلبگار نہ ہو۔ لیکن تم میں ایسی ذہنیت رکھنے والے لوگ پیدا ہو جاتے ہیں جو سب کچھ سمیٹ کر اپنے لئے رکھنا چاہتے ہیں۔ یاد رکھو وَمَنْ يَّبْخَلْ فَاِنَّمَا يَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ جو شخص دوسروں کو مال و دولت سے محروم رکھتا ہے وہ درحقیقت اپنی ذات کو سعادتوں اور کامرانیوں سے محروم رکھتا ہے۔ اس سے اللہ کا کچھ نہیں بگڑتا۔ وَاللّٰهُ الْغَنِيُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ۔ اللہ تمہارے مال و دولت سے بے نیاز ہے اور تم اپنی نشو و نما کے لئے اس کے محتاج ہو۔ بہرحال اسے اچھی طرح سن رکھو کہ اِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ۔ اگر تم نے حق کے نظام سے منہ موڑ کر غلط روش اختیار کر لی تو وہ تمہاری جگہ دوسری قوم لے آئے گا ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ (۴۷/۳۸) اور وہ قوم تمہارے جیسی نہیں ہوگی۔ تم نے غور کیا سلیم! کہ آیت کے آخری ٹکڑے میں قرآن نے کتنی گہری بات کہدی ہے؟ اس نے کہا ہے کہ قوموں کی ادلا بدلی یونہی اندھا دھند نہیں ہو جاتی کہ ایک قوم مٹادی جاتی ہے اور اسکی جگہ اس جیسی ایک اور قوم آجاتی ہے۔ اگر اسکی جگہ اسی جیسی قوم نے آنا ہو تو پہلی قوم کو مٹایا ہی کیوں جائے۔ (محض تبدیلی کی خاطر تبدیلی CHANGE FOR CHANGE SAKE کی نسبت خدا کے بارے (اللہ کے شایانِ شان نہیں) ایک قوم مٹتی ہی اسوقت ہے جب اسمیں باقی رہنے کی صلاحیت نہیں رہتی۔ لہٰذا اس کی جگہ وہی قوم آسکتی ہے جسمیں زندہ رہنے اور آگے بڑھنے کی صلاحیت ہو۔ یہاں گردشِ دولابی نہیں کہ ایک کلچر نے کچھ وقت کے بعد مٹنا ہی اور اس کی جگہ دوسرے کلچر نے لینی ہے۔ خواہ یہ دوسرا کلچر اس پہلے کلچر جیسا یا اس سے بدتر ہی کیوں نہ ہو۔ یہاں حق و باطل کی کشمکش ہے۔ مٹتی وہ قوم ہے جو حق پر نہ ہو اور اسکی جگہ آتی وہ قوم ہے جو اس کے مقابلہ میں حق پر ہو۔ یہ ہیں معنی ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ کے یعنی وہ قوم تمہارے جیسے کلچر کی حامل نہیں ہوگی۔

اس کے بعد قرآن ایک ایسی حقیقت کو سامنے لاتا ہے کہ نگہِ بصیرت جوں جوں اس پر غور کرتی ہے، وجد و مسرت سے جھوم اٹھتی ہے اس لئے کہ اس میں قوموں کی موت و حیات کا ایک ایسا راز پوشیدہ ہے جس تک بہت کم نگاہیں پہنچتی ہیں۔ دنیا میں ہر پروگرام کے دو حصے ہوتے ہیں۔ پہلا حصہ پلان اور اسکیم کا ہوتا ہے۔ اسمیں پروگرام کے مختلف پہلوؤں پر فکری طور پر غور کیا جاتا ہے۔ اس کے مالہ وماعلیہ (PROS & CONS) کو سامنے لایا جاتا ہے اس کی عملی تشکیل کے مختلف نقشے بنائے جاتے ہیں۔ اس پر پوری پوری بحث و تمحیص کی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ حصہ محض لفظوں اور باتوں، کاغذوں اور لکیروں پر مشتمل ہوتا ہے۔ لیکن مس پروگرام کی تکمیل کے لئے یہ ہوتا ہے نہایت ضروری۔ جب اس حصہ کی تکمیل ہو جاتی ہے، تو پھر اس پروگرام کا عملی پہلو شروع ہو جاتا ہے اور جو چیزیں اس وقت تک باتوں اور نقشوں تک محدود تھیں وہ اب رفتہ رفتہ محسوس پیکروں میں سامنے آنے لگ جاتی ہیں۔ جو قوم اس طرح پروگرام بناتی اور انھیں تکمیل تک پہنچاتی ہے وہ

محض باتیں بنانے والے

کامیاب و کامران رہتی ہے۔ لیکن اگر کوئی قوم ساری عمر اسکیمیں ہی بناتی رہے۔ تمام وقت سوچنے ہی میں صرف کر دے۔ زندگی بھر باتیں ہی کرتی رہے۔ اور عملاً ایک قدم نہ اٹھائے۔ وہ قوم تباہ و برباد ہو کر رہتی ہے۔ خواہ

اسکی فکر کتنی ہی ثریا بوس اور اسکی نگاہ کیسی ہی فلک رس کیوں نہ ہو۔ بالفاظ دیگر قومیں محض فلسفے کے سہارے زندہ نہیں رہ سکتیں۔ زندگی عمل سے بنتی ہے۔ فلسفہ فکری صلاحیتوں کو جلا دیتا ہے تاکہ ان سے عمل کی راہیں روشن ہوجائیں۔ لیکن اگر کوئی قوم محض فلسفی بن کر رہ جائے اور عمل کے لئے کوئی قدم نہ اٹھائے تو اسکی مثال اس راہ گذر کی ہوگی جو رات چلنے کے لئے شمع روشن کرے لیکن اس شمع کو لیکر اپنی کوٹھری میں بیٹھ رہے۔ ظاہر ہے کہ یہ مسافر عمر بھر اپنی منزل تک نہیں پہنچ سکیگا۔ اور اسکی لالٹین کا تیل بھی بیکار جلے گا جو قومیں عمل سے بیگانہ ہوجائیں ان کے مفکر مابعد الطبیعاتی مسائل (METAPHYSICAL PROBLEMS) کے حل کرنے میں دماغ سوزی کرتے رہتے ہیں۔ اور انکے لیڈر اسکیمیں بنانے میں مصروف اور بیانات دینے اور تقریریں کرنے میں مشغول رہتے ہیں۔ اور دونوں یہ سمجھتے ہیں کہ ہم بڑے کارہائے نمایاں سرانجام دے رہے ہیں۔ حالانکہ نہ اُن مفکرین کی فکر اور نہ ان لیڈروں کے الفاظ قوم کو تباہی سے بچا سکتے ہیں۔ جو قوم زندگی کے عملی مسائل کی طرف سے آنکھیں بند کرکے نظری مباحث میں الجھ کر رہ جاتی ہیں، اس کی موت یقینی ہے۔ اسی لئے اقبال نے کہا ہے کہ

اگر نہ سہل ہوں تجھ پر زمیں کے ہنگامے — بری ہے مستی اندیشہ ہائے افلاکی

قرآن نے اسے خوضؔ سے تعبیر کیا ہے جس کے معنی ہیں بیکار باتوں میں الجھنا۔ یونہی نظری طور پر مسائل کی گہرائیوں میں اترنا۔

اب اس حقیقت کے دوسرے پہلو کو لو۔ زندگی کا تعلق بیشتر ان معاملات سے ہے جن کی کوئی نہ کوئی افادی حیثیت UTILITAREAN VALUE ہو لیکن انسانی طبیعت ایسی واقع ہوئی ہے کہ اسے کام کے ساتھ ساتھ اعصاب کے سکون کی بھی ضرورت ہے۔ فنونِ لطیفہ (FINE ARTS) کا زیادہ تعلق زندگی کے اسی پہلو سے ہے۔ انسانی زندگی میں کام کی حیثیت اگر پٹرول کی ہے تو فنونِ لطیفہ کی حیثیت موبل آئل کی ہے۔ اس سے زندگی کے موٹر کے پرزے آپس میں رگڑ نہیں کھاتے۔ ان میں (FRICTION) نہیں پیدا ہوتی۔ لوچ اور لچک رہتی ہے لیکن آپ

فنونِ لطیفہ

سوچئے کہ اگر کسی موٹر میں پٹرول کی جگہ بھی موبل آئل ہی ڈالدیا جائے تو وہ ایک قدم بھی نہیں چل سکیگا۔ یہی حالت ان قوموں کی ہوتی ہے جو زندگی کے عملی پہلوؤں کو یکسر نظر انداز کردیں اور اپنی ساری توجہ فنونِ لطیفہ کی ترقی اور نشو ونما پر مرکوز رکھیں۔ وہ قوم مصاف زندگی میں دوسری قوموں کا مقابلہ کبھی نہیں کرسکتی۔ قرآن نے اسے لعبؔ سے تعبیر کیا ہے۔ جس کے معنی کھیل تماشے کے ہوتے ہیں۔

قرآن کہتا ہے کہ جو کلچر خوض اور لعب ہی کو مقصودِ حیات سمجھے اس کی حامل قوم کبھی زندہ نہیں رہ سکتی۔ سورۂ معارج میں ہے کہ اِنَّا لَقٰدِرُوْنَ عَلٰٓی اَنْ نُّبَدِّلَ خَیْرًا مِّنْھُمْ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوْقِیْنَ۔ ہم اس پر قادر ہیں کہ اس مخاطب قوم کی جگہ ایک ایسی قوم کو لے آئیں جو ان سے بہتر ہو۔ یہ ہمیں ایسا کرنے سے روک نہیں سکتے فَذَرْھُمْ یَخُوْضُوْا وَیَلْعَبُوْا حَتّٰی یُلٰقُوْا یَوْمَھُمُ الَّذِیْ یُوْعَدُوْنَ (۷۰/۴۲) سو تو انھیں خوض ولعب میں مشغول رہنے دے۔ تا آنکہ وہ روزِ بد ان کے سامنے آجائے جس کے متعلق ان سے کہا جاتا ہے کہ وہ آکر رہے گا۔

تاریخ کے اوراق پر یونان کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ اس قوم کا حکمت وفلسفہ میں یہ عالم تھا کہ ان کے مفکرین کا شمار آج تک دنیائے فکر کی صفِ اول میں ہوتا ہے۔ اسکے ساتھ ہی فنونِ لطیفہ (مصوری، مجسمہ تراشی، موسیقی اور شاعری) میں بھی وہ جس مقام تک پہنچ چکے تھے بہ حیثیت مجموعی اس کی مثال کہیں اور نہیں ملتی۔ لیکن عملی اور افادی دنیا میں ان کی یہ حالت تھی کہ وہ ایک سوئی تک بھی اپنے ہاں تیار نہیں کرسکتے تھے۔ نتیجہ اسکا یہ ہوا کہ وہ قوم اس طرح نیچے گری کہ اسے پھر ابھرنا نصیب ہی نہیں ہوا۔ ان کا بلند ترین فلسفہ اور لطیف ترین فنون انھیں اس

اس تباہی سے تعلقاً نہ بچا سکے۔ ان کی جگہ ان قوموں نے لے لی جو خیر منصم (ان سے بہتر) تھیں۔ استبدال اور انتخاب توی کا یہ بھی ایک اہم قانون ہے جسے قرآن نے اس انداز سے پیش کیا ہے۔

جدوجہد سے جی چرانے والے

اسکے بعد قرآن نے ایک ایسا قانون پیش کیا ہے جسے ان تمام قوانین کا اصل الاصول اور ان تمام اصولوں کا لب لباب کہنا چاہیئے۔ وہ کہتا ہے کہ زندگی مسلسل جدّ و جہد کا نام ہے۔ مسلسل جد و جہد، پیہم سعی و عمل، غیر منقطع تگ و تاز۔ ان تھک کوشش اس کا نام ہے زندگی۔

گردشِ پیہم سے پختہ تر ہے جامِ زندگی ہے یہی اے بے خبر رازِ دوامِ زندگی

جو قوم جس سانس میں جد و جہد (جہاد) سے جی چراتی ہے اسی سانس میں اس پر موت طاری ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ موت درحقیقت نام ہی ترکِ جہاد کا ہے

نگر کوتاہیٔ ذوقِ عمل ہے خود گرفتاری جہاں بازو سمٹتے ہیں وہیں صیاد ہوتا ہے

قرآن نے اس حقیقت کو واضح الفاظ میں بیان کر دیا ہے کہ جو قوم جہادِ زندگی سے جی چراتی ہے۔ تباہ و برباد ہو جاتی ہے۔ سورۃ توبہ میں ہے یَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَا لَكُمْ إِذَا قِيلَ لَكُمُ انفِرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ اثَّاقَلْتُمْ إِلَى الْأَرْضِ اے جماعت مومنین! تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ جب تم سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کی راہ میں باہر نکلو تو تمہارے پاؤں بوجھل ہو کر زمین گیر ہو جاتے ہیں أَرَضِيتُم بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا مِنَ الْآخِرَةِ کیا تم مستقبل کے مفاد کو چھوڑ کر مفادِ عاجلہ پر ریجھ گئے ہو فَمَا مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا فِي الْآخِرَةِ إِلَّا قَلِيلٌ۔ اگر ایسا ہی ہے تو تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ قریبی مفاد مستقبل کے مفاد کے مقابلہ میں کچھ حیثیت ہی نہیں رکھتا إِلَّا تَنفِرُوا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا أَلِيمًا۔ اگر تم جہادِ زندگی کے لئے باہر نہ نکلے تو یاد رکھو تم پر سخت تباہی آ جائیگی وَيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ اور خدا کا قانونِ مکافات تمہاری جگہ ایک دوسری قوم لے آئے گا وَلَا تَضُرُّوهُ شَيْئًا۔ اور تم خدا کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکو گے وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (۹/۳۸-۳۹) اللہ کا قانون نافذ العمل ہو کر رہتا ہے اس میں اس کی قدرت ہے۔

ان مقامات میں تم نے دیکھ لیا سلیم! کہ قرآن نے قوموں کے عروج و زوال اور انکی موت و حیات کے لئے کیا قوانین و اصول بیان کئے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ تم تاریخِ انسانیت پر غور کرو اور دیکھو کہ ہر قوم کی داستان کس طرح انہی قوانین کی صداقت کی شہادت بہم پہنچاتی ہے۔ اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ جب پہلے یہی کچھ ہوتا رہا ہے تو اب بھی یہی کچھ ہوگا۔ وراثتِ ارض نہ آباؤ اجداد سے ترکہ میں ملسکتی ہے نہ بخشش کے طور پر۔ اس کے لئے ایک اٹل قانون مقرر ہے۔ وہ قانون کیا ہے اسے قرآن نے چند الفاظ میں یوں سمٹا کر رکھدیا ہے جیسے آنکھ کے تل میں پہاڑ سما جائے

صلاحیت بنیادی شرط ہے

سورۃ انبیاء میں ہے وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِن بَعْدِ الذِّكْرِ ہم نے ہر آسمانی صحیفہ میں ضروری قوانین اور تاریخی یادداشتیں درج کرنے کے بعد اس اصول الاصول کو محکم طور پر بیان کر دیا ہے کہ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ۔ یہ ایک اٹل حقیقت ہے زمین کے وارث وہی لوگ ہو سکتے ہیں جن میں اسکے لئے ضروری صلاحیت موجود

ہو اِنَّ فِیْ ھٰذَا لَبَلٰغًا لِّقَوْمٍ عٰبِدِیْنَ (۲۱/۱۰۶) یہ قانون ایسا ہے جس میں ہر اس قوم کے لئے جو اپنی زندگی کو نظامِ خداوندی کے تابع رکھنا چاہے ایک دورس حقیقت پوشیدہ ہے۔ اسی محکم اصول کے مطابق خود مسلمانوں سے کہدیا کہ وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّھُمْ فِی الْاَرْضِ۔ جو لوگ تم میں سے خدا کے قانون کی محکمیت پر یقین رکھ کر اسکے

استخلاف فی الارض

متعین فرمودہ صلاحیت بخش پروگرام پر عمل پیرا ہوں گے۔ ان کے متعلق خدا کا فیصلہ ہے کہ وہ انھیں زمین میں حکومت عطا کرے گا۔ اور یہ چیز انھیں کسی خصوصی رعایت (AS A SPECIAL FAVOUR) نہیں ملیگی۔ یہ خدا کے اسی قانون کی رو سے ہوگا جسکے مطابق اقوامِ سابقہ کو بھی حکومت ملتی رہی ہے کَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ (جیسا کہ اس نے اقوامِ سابقہ کو حکومت عطا کی تھی) یہ اسلئے ہوگا کہ لَیُمَکِّنَنَّ لَھُمْ دِیْنَھُمُ الَّذِی ارْتَضٰی لَھُمْ تاکہ وہ نظامِ زندگی (دین) جسے انکے لئے تجویز کیا گیا ہے متمکن ہو جائے (اس سے واضح ہے سلیم! کہ حکومت کے بغیر دین ممکن (ESTABLISHED) ہو نہیں سکتا) وَلَیُبَدِّلَنَّھُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِھِمْ اَمْنًا۔ اور تاکہ وہ انکے خوف کو امن سے بدل دے۔ اس سے ہوگا یہ کہ یَعْبُدُوْنَنِیْ لَا یُشْرِکُوْنَ بِیْ شَیْئًا۔ وہ صرف میرے قوانین ہی کی محکومیت اختیار کرسکیں گے اور ان میں کسی اور کے قوانین کو شریک نہیں کرینگے (اس سے یہ بھی واضح ہے کہ خدا کی عبادت سے مقصود کیا ہے اور وہ کس طرح اپنی حکومت میں ہی ادا ہو سکتی ہے۔ اگر عبادت سے مقصود محض نماز روزہ کی ادائیگی ہوتا تو اسکے لئے اپنی حکومت کی ضرورت ہی نہیں۔ انھیں تو محکوم مسلمان بھی اسی طرح ادا کرسکتے ہیں جس طرح آزاد) اسکے بعد ہے وَمَنْ کَفَرَ بَعْدَ ذٰلِکَ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْفٰسِقُوْنَ (۲۴/۵۵) اور جس قوم نے اس قسم کے ایمان و عمل صالح کے بعد پھر انکار کی راہ اختیار کرلی تو ان کے متعلق سمجھ لو کہ وہ سیدھے راستے سے پھر گئے۔ ان کا نتیجہ تباہی و بربادی کے سوا کچھ نہیں ہوگا فَھَلْ یُھْلَکُ اِلَّا الْقَوْمُ الْفٰسِقُوْنَ (۴۶/۳۵)

ان تصریحات سے واضح ہے کہ قرآن کی رو سے قوموں کی موت اور حیات کے لئے ایک محکم قانون مقرر ہے۔ جو قوم اس قانون کے مطابق زندگی بسر کرتی ہے اسے زندگی کی توانائیاں مل جاتی ہیں جس کا نتیجہ عروج و اقبال ہوتا ہے جو اس قانون کے خلاف زندگی بسر کرتی ہے اسکے حصہ میں تباہیاں اور بربادیاں آجاتی ہیں۔ اللہ نے یہ قانون مقرر کر دیا اور انسان کو اس کا اختیار دیدیا کہ وہ جونسا راستہ چاہے اختیار کرلے۔ اگر وہ چاہے تو زندگی بخش اصولِ حیات اختیار کرلے اگر چاہے تو فنا در آغوش راستے پر چل پڑے۔ تم نے دیکھا سلیم! کہ اس باب میں قرآن نے کس قدر واضح تعلیم دیدی ہے۔ لیکن تم حیران ہوگے کہ اسی قرآن کی حامل قوم (مسلمان) اب یہ عقیدہ رکھتی ہے کہ یہاں اختیار و ارادہ کا سوال ہی کوئی نہیں۔ انسان مجبورِ محض واقع ہوا ہے افراد کی طرح قوموں کی موت اور زندگی کا بھی ایک وقت مقرر ہے اور جب وہ وقت آجاتا ہے تو اسمیں ایک ساعت کی بھی کمی بیشی نہیں ہوسکتی نہ کوئی قوم اپنی کوششوں سے اس وقت کو بڑھا سکتی ہے۔ نہ اپنی کوتاہیوں اور لغزشوں سے اسمیں کمی کرسکتی ہے اور حیرت بالائے حیرت یہ کہ اپنے اس غیر قرآنی عقیدہ کی تائید میں سند بھی قرآن ہی سے پیش کرتی ہے۔ سچ کہا تھا قرآن نے کہ یُضِلُّ بِہٖ کَثِیْرًا وَّیَھْدِیْ بِہٖ کَثِیْرًا (۲/۲۶) اقبال کے الفاظ میں۔

اسی قرآں میں ہے اب ترکِ جہاں کی تعلیم — جس نے مومن کو بنایا مہ و پرویں کا امیر
تن بہ تقدیر ہے آج ان کے عمل کا انداز — تھی نہاں جن کے ارادوں میں خدا کی تقدیر
تھا جو ناخوب بتدریج وہی خوب ہوا — کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

اس عقیدہ کی تائید میں قرآن کی جو آیت پیش کی جاتی ہے وہ یہ ہے وَلِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ ۖ فَإِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ لَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً ۖ وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ۔ (۷/۳۴) ہر قوم کیلئے ایک اجل ہے جب انکی اجل آجاتی ہے تو ایک ساعت کی بھی کمی بیشی نہیں ہو سکتی۔

ہر قوم کی اجل

میں تمہیں پہلے بتا چکا ہوں کہ ہر عمل اور اسکے نتیجے کے ظہور میں ایک وقفہ ہوتا ہے اس وقفہ کی مدت یا میعاد کو اجل کہا جاتا ہے۔ اس اجل (ظہور نتائج کے وقت) سے پہلے پہلے اگر وہ قوم اپنی روش بدل لے تو وہ اپنی سابقہ غلط روش کے تباہ کن نتائج سے بچ سکتی ہے لیکن جب وہ نتائج مرتب ہو کر سامنے آجائیں تو پھر انھیں کوئی نہیں ٹال سکتا۔ مختلف اعمال کے لئے یہ مہلت کا وقفہ (اجل) مختلف ہوتا ہے جس طرح مثلاً کیلا سال کے بعد پھل دیدیتا ہے اور کھجور کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ چالیس سال کے بعد پھل لاتی ہے یا مثلاً تھوڑی تھوڑی مقدار میں افیون کھلانے سے (SLOW POISONING) ہوتی ہے اور ایک ہی بار زیادہ کھلانے سے فوری موت واقع ہو جاتی ہے جسے ہم موت کہتے ہیں وہ درحقیقت ظہور نتائج کا وقت ہوتا ہے۔ یہ نتائج بہت پہلے سے مرتب ہونا شروع ہو چکے ہوتے ہیں۔ انکی نمود ایک خاص وقت پر جا کر ہوتی ہے اسے اجل کہتے ہیں۔) اور اسکے لئے بھی قانون مقرر ہے کہ فلاں قسم کے اعمال کے ظہور نتائج کے لئے کتنی مدت (اجل) درکار ہے اور فلاں قسم کے اعمال کے لئے کتنی۔ دیکھو۔ قرآن نے اس حقیقت کو کس قدر نمایاں الفاظ میں بیان کیا ہے۔ جیسا کہ تم دیکھ چکے ہو۔ سورۂ اعراف میں ہے۔ لِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ (۷/۳۴) (ہر قوم کیلئے ایک اجل ہے) اور سورۂ رعد میں ہے لِكُلِّ أَجَلٍ كِتَابٌ (۱۳/۳۸) (ہر اجل کیلئے ایک قانون مقرر ہے) يَمْحُو اللَّهُ مَا يَشَاءُ وَيُثْبِتُ۔ خدا کا یہی قانونِ مشیت ہے جس کی رو سے قوموں کا محو و ثبات عمل میں آتا رہتا ہے۔ قومیں مٹتی رہتی ہیں اور ثابت و قائم رہتی ہیں۔ یہ قانونِ مشیت انسانوں کا بنایا ہوا نہیں ہے۔ یہ خدا کا کائناتی قانون ہے جس کی اصل و بنیاد (سرچشمہ ROOT) خود خدا کے پاس ہے۔ وَعِنْدَهُ أُمُّ الْكِتَابِ (۱۳/۳۹) لہٰذا کوئی اس میں تغیر و تبدل نہیں کر سکتا یہ انسانوں کی دسترس سے باہر ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ قانون کیا ہے جس کی رو سے قوموں کا محو و ثبات عمل میں آتا رہتا ہے اسکے متعلق پھر دہراؤ۔ وَيَمْحُ اللَّهُ الْبَاطِلَ وَيُحِقُّ الْحَقَّ بِكَلِمَاتِهِ (۴۲/۲۴) خدا اپنے قانون کی رو سے باطل کو محو کرتا رہتا ہے اور حق کو محکم اور اٹل بناتا ہے۔ ہر وہ کلچر مٹ جاتا ہے جو باطل پر مبنی ہو اور وہ باقی رہتا ہے جو حق پر استوار ہو۔

اگرچہ یہ اصول بالکل واضح طور پر سامنے آچکا ہے کہ وہ کونسا کلچر ہے جس میں باقی رہنے کی صلاحیت ہوتی ہے اور وہ کونسا جس کی تعمیر میں خرابی کی صورت مضمر ہے لیکن قرآن تجریدی اصولوں (ABSTRACT PRINCIPLES) کو محسوس مثالوں (CONCRETE EXAMPLES) سے واضح کر دیتا ہے تاکہ ان کا صحیح مفہوم متعین کرنے میں کسی قسم کی دقت نہ ہو اور ان میں کوئی ابہام یا ایہام نہ رہے چنانچہ اس نے اس حقیقت کو بھی محسوس مثال کے ذریعے واضح کر دیا ہے کہ وہ کونسا کلچر یا نظام ہے جس میں دوام و استمرار کی صلاحیت ہوتی ہے سورۂ رعد میں ہے

بقا کا محکم اصول

أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَسَالَتْ أَوْدِيَةٌ بِقَدَرِهَا۔ اللہ بادلوں سے بارش برساتا ہے تو ندی نالے اپنے اپنے ظرف کے مطابق بہنے شروع ہو جاتے ہیں فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَابِيًا تو یہ سیلاب زمین کے خس و خاشاک پر کاہ کی طرح بہا کر لے جاتا ہے یعنی پانی کی منفعت بخش نمی زمین میں جذب ہو جاتی ہے اور کوڑا کرکٹ جس میں نفع رسانی کی صلاحیت نہیں ہوتی، نذرِ سیلاب ہو جاتی ہے۔

یہ پہلی مثال ہے۔ دوسری مثال ہے وَمِمَّا يُوقِدُونَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ ابْتِغَاءَ حِلْيَةٍ أَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِثْلُهُ جب تم چاندی اور دھات کو سنار اپنی کٹھالی میں ڈال کر آگ میں تپاتا اور گلاتا ہے تاکہ اس سے زیور یا اور سامان بنائے تو اس میں جلا ہوا کھوٹ جھاگ کی طرح اوپر آجاتا ہے

كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ۔ اسی طرح خدا کے قانون کے مطابق حق و باطل کی کشمکش جاری رہتی ہے فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاۗءً وہ کھوٹ جو جھاگ کی طرح اوپر آجاتا ہے رائگاں چلا جاتا ہے۔ وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ (اور جو چیز نوع انسانی کیلئے منفعت بخش ہوتی ہے وہ زمین میں باقی رہ جاتی ہے۔ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ (۱۳/۱۷) اسی طرح اللہ محسوس مثالوں کے ذریعے مجرد حقائق کی وضاحت کرتا ہے۔ تم نے غور کیا سلیم! کہ قرآن نے بقا، دوام کے لئے کیا قانون بتایا ہے؟ یہ قانون کہ مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ۔ اسی کلچر اور نظام میں باقی رہنے کی صلاحیت ہوتی ہے جو تمام نوع انسانی کی نفع رسانی کا موجب ہو۔ کسی خاص خاندان۔ خاص گروہ۔ خاص پارٹی۔ خاص جماعت یا خاص قوم کی نفع رسانی کا موجب نہیں، تمام نوع انسانی کی نفع رسانی کا موجب۔

میں سمجھتا ہوں سلیم! کہ یہ وہ اصول ہے جسے خورشید کی شعاعوں سے صفحۂ آسمان پر لکھ دینا چاہیئے تاکہ یہ حقیقت دنیا کی ہر قوم کے سامنے بروقت رہے کہ بقا، دوام کا ابدی قانون کیا ہے۔ مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ۔

ہماری باز آفرینی کی صورت!

اسکے بعد تمہارا یہ سوال سامنے آتا ہے کہ ذلت و خواری کی جس پستی میں ہم (مسلمان) گر چکے ہیں، کیا ہمارے لئے اس سے نجات کی بھی کوئی صورت ہے یا ہم ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ہلاک ہو چکے ہیں اور ہماری باز آفرینی کی کوئی صورت باقی نہیں؟ قرآن کہتا ہے کہ نہیں! ایسی مایوسی کی کوئی بات نہیں تمہیں دوبارہ زندگی مل سکتی ہے تم پھر عروج تک پہنچ سکتے ہو بشرطیکہ.....

ہاں سلیم! یہ ٹکڑہ بہت غور طلب ہے۔ بلکہ یہی تو اس ساری کہانی کی جان ہے۔ بشرطیکہ..... لیکن اس تک پہنچنے سے پہلے چند چیزیں، تمہید اً سامنے لانا ضروری ہیں

تم نے دیکھا ہے کہ قوموں کی موت اور حیات کے معنی ہیں مختلف کلچرز کا باہمی تکراؤ۔ قرآن نے مختلف کلچرز کو دو بنیادی شقوں (CATEGORIES) میں تقسیم کر دیا ہے۔ ایک کلچر وہ ہے جس میں ایک قوم قوانین خداوندی کے پیچھے پیچھے چلتی ہے اسے قرآن نے صلوٰۃ کی جامع اصطلاح سے تعبیر کیا ہے۔ دوسرا کلچر وہ ہے جس میں انسان خود اپنے خیالات اور خواہشات کی اتباع کرتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ حضرات انبیاء کرام اور ان کی متبع جماعتیں صلوٰۃ کے کلچر کی حامل ہوتی ہیں جس کا نتیجہ ہر قسم کی شادکامی اور کامرانی ہوتا ہے لیکن پھر انکے بعد ایسے ناخلف پیدا ہو جاتے ہیں جو اس روش زندگی کو چھوڑ کر دوسرا کلچر اختیار کر لیتے ہیں۔ اور اس طرح یہ قوم تباہ ہو جاتی ہے سورہ مریم میں مختلف انبیاء کرام کے تذکار جلیلہ کے سلسلہ میں فرمایا کہ یہ وہ حضرات تھے جنہیں اللہ نے زندگی کی ہر قسم کی آسودگیوں اور خوشحالیوں سے نوازا (اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ) لیکن ان کے بعد

فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا (۱۹/۵۹)

ان کے بعد ایسے ناخلف ان کے جانشین ہو گئے جنہوں نے صلوٰۃ کے نظام کو ضائع کر دیا اور اپنے خیالات اور خواہشات ہی کے پیچھے چل پڑے۔ سو ایسا کرنے والوں کی سرکشی کے نتائج ان کے سامنے آکر رہتے ہیں۔

اس سے ظاہر ہے کہ نظام صلوٰۃ کے قیام کا نتیجہ نعمائے زندگی سے سرفرازی ہے اور اسے ترک کر دینے کا انجام ان آسودگیوں سے محرومی ہے اس اصول کے بعد مسلمانوں کی طرف آیئے۔ سورۂ فاطر میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہؐ کو وحی کے ذریعے اپنا آخری پیغام دیدیا اور حضورؐ کے بعد ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا ہم نے اپنے بندوں میں سے ایک منتخب قوم کو اس کتاب کا وارث بنایا۔ یہ قوم اپنے اولیں ایام

میں اس نظام کو قائم کرنے میں پیش پیش رہی۔ پھر اگلا دور آیا تو ان کی حالت بَین بَین کی سی ہوگئی۔ اور اس کے بعد یہ بالکل دوسرے راستے پر چل پڑے فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهِ وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ وَمِنْهُمْ سَابِقٌ بِالْخَيْرَاتِ بِإِذْنِ اللّٰهِ (۳۵/۳۲) ہم اس تیسرے دور میں ہیں۔ اسی حقیقت کو قرآن نے سورۂ عمران میں زیادہ وضاحت سے بیان کیا ہے۔ اس میں پہلے یہ بتایا گیا ہے کہ اسلام کی راہ کون سی ہے اور اسے حضرات انبیاء کرامؑ نے کس طرح اختیار کیا۔ اس کے بعد اس حقیقت کا اعلان ہے کہ فلاح و فوز اور سعادت و برکات کی یہی ایک راہ ہے۔ وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِيْنَ (۳/۸۵) جو قوم اس راہ کو چھوڑ کر کوئی دوسری راہ اختیار کرلیگی تو اسکی یہ راہ قابلِ قبول نہیں ہوگی اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ آخر الامر تباہ و برباد ہو جائیگی۔ اس کے بعد مسلمانوں کی تاریخ سامنے لائی گئی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ إِيْمَانِهِمْ بھلا سوچو کہ خدا اس قوم پر زندگی کی راہیں کس طرح کشادہ کردیگا جس نے ایمان کے بعد کفر کی روش اختیار کرلی ہو وَشَهِدُوْا أَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ وَّجَاءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ حالانکہ ان کی طرف خدا کا واضح ضابطۂ حیات آچکا تھا۔ اور وہ اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرچکے تھے کہ ان کے رسول نے اس ضابطۂ حیات پر عمل پیرا ہو کر کس طرح تعمیری نتائج پیدا کر دکھائے تھے یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ لینے کے بعد اس قوم نے کفر کی راہ اختیار کرلی وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ سو ایسی ظالم قوم کو خدا کس طرح سعادتوں کی راہ دکھائے! أُولٰئِكَ جَزَآؤُهُمْ أَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللّٰهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِيْنَ۔ ان کی اس روش کا فطری نتیجہ یہ ہوا کہ یہ قوم ان تمام آسودگیوں سے محروم ہوگئی جو نظامِ خداوندی سے وابستگی سے حاصل ہوتی تھیں۔ اور ان تمام آسائشوں سے بھی محروم ہوگئی جو فطرت کی قوتوں کو مسخر کرنے سے ملتی تھیں حتیٰ کہ انکی ذلت و پستی کی وجہ سے دوسری قومیں بھی انھیں اپنے پاس نہیں آنے دیتیں۔ دور دور رکھتی ہیں لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ اس بنا پر کہ انھوں نے اپنا نام مسلمان رکھ چھوڑا ہے انکی اس تباہی میں کسی طرح کمی واقع نہیں ہوسکتی۔ نہ ہی انھیں اس سے زیادہ مہلت مل سکتی تھی جتنی مہلت خدا کے قانونِ امہال و تدریج کی رو سے ملا کرتی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا ان کی یہ محرومی ابدی اور یہ تباہی ہمیشہ کے لئے ہے یا اس سے رستگاری کی صورت ممکن ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ ممکن ہے مندرجہ بالا آیات کے بعد ہے إِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ وَأَصْلَحُوْا فَإِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۳/۸۹-۸۵) ہاں اگر یہ اپنی اس روش کو چھوڑ کر پچھلے پاؤں مڑ جائیں اور پھر اس مقام پر پہنچ جائیں جہاں سے ان کا قدم غلط راستے پر پڑ گیا تھا اور وہاں پہنچ کر پھر خدا کے متعین کردہ صلاحیت بخش پروگرام پر عمل پیرا ہو جائیں تو خدا کا قانون اس تباہی و بربادی سے ان کی حفاظت بھی کردے گا اور ان کی نشوونما کا پورا پورا سامان بھی مہیا کردے گا۔ بس یہی ان کی بازآفرینی کی صورت ہے۔

تم دیکھو سلیم! قرآن نے واضح الفاظ میں بتا دیا ہے کہ اس امت کو جو سرفرازیاں شروع میں نصیب ہوئی تھیں وہ ان بینات (قرآن کے واضح قوانین) پر چلنے کا نتیجہ تھیں جو انھیں خدا کی طرف سے ملے تھے۔ پھر جب انھوں نے اس قرآن کو چھوڑ دیا تو یہ ان تمام برکات سے محروم ہوگئے۔ اور اب ان کی بازیابی کی صورت فقط ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ یہ پھر قرآن کے مطابق نظامِ زندگی متشکل کرلیں۔ اس کے سوا ان کی نشاۃ ثانیہ کی کوئی صورت نہیں ہوسکتی خواہ یہ کچھ ہی کیوں نہ کرلیں۔

کیوں سلیم! بات آئی سمجھ میں! اچھا خدا حافظ۔ والسلام۔

کنونشن کے بعد

(محترم عبدالرب صاحب)

طلوع اسلام کنونشن کی روداد دسمبر ۱۹۵۶ء کی اشاعت میں قارئین کی نظروں سے گذر چکی ہے۔ کنونشن کے بعد مختلف مقامات کے حضرات اپنے اپنے مستقر کی طرف لوٹ گئے لیکن محترم پرویز صاحب احباب کے تقاضہ اور مقصد کی اہمیت کے پیش نظر سابقہ پنجاب اور سرحد کے مختلف مقامات میں گئے اور ۵ر دسمبر کو کراچی واپس آئے۔ میں ان کی رفاقت میں تھا۔ اسلئے میں نے ضروری سمجھا ہے کہ جو کچھ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اس کے اثر و کیف میں (ایک حد تک ہی سہی) قارئین طلوع اسلام کو بھی شریک کر لیا جائے۔ ایک حد تک اس لئے کہ جو کچھ آنکھیں دیکھتی ہیں اور دل محسوس کرتا ہے۔ اسے اُسی طرح الفاظ میں بیان کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔

کنونشن ۱۸ر نومبر کو ختم ہو گیا تھا۔ ۱۹ر کی صبح کو بزم طلوع اسلام لاہور کے ارباب ہم اس مقصد کے لئے جمع ہوئے کہ جو
لاہور کچھ کنونشن میں الفاظ میں کہا گیا ہے اسے عملاً متشکل کرنے کے لئے باہمی مشورے کئے جائیں اور ان میں پرویز صاحب کی موجودگی سے فائدہ اٹھایا جائے۔ یہ تمام احباب بھی تر و تازہ دم نظر آتے تھے۔ حالانکہ انھوں نے گذشتہ دو مہینے جس محنت اور مشقت سے دن رات ایک کر دیا تھا اس کا طبعی نتیجہ یہ ہونا چاہیئے تھا کہ وہ تکمیل کار کے بعد تکان محسوس کرتے۔ لیکن کنونشن نے زندگی اور حرارت کی جو فضا پیدا کر دی تھی اس نے اُن جیسے جواں سال احباب کے دل میں تو ایک طرف، ہم جیسے پیران کہن سال کے عروقِ مردہ میں بھی خون زندگی دوڑا دیا تھا۔ دن بھر انہی مشوروں اور مذاکروں میں گذرا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ ایک مقصد کی تکمیل کے بعد جمع نہیں ہوئے بلکہ ایک پروگرام کی ابتدا کے لئے اکٹھے ہوئے ہیں۔ زندگی اسی کا نام ہے کہ جہاں پچھلا سانس ختم ہو وہیں سے نئے سانس کا آغاز ہو جائے۔

پروگرام کے مطابق ۱۹ر کی شام کو اسلامیہ کالج کے حبیبیہ ہال میں پرویز صاحب کی عام تقریر تھی جس کا عنوان تھا "جنسیات کا اثر قوموں کی تہذیب و تمدن پر"۔ لیکن قبل اس کے کہ میں اس ضمن میں اصل واقعہ تک آؤں چند الفاظ تمہیداً عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ قرآن نے کہا ہے کہ وَمَنْ يَّدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ لَا بُرْهَانَ لَهٗ بِهٖ (۲۳/۱۱۷) جو شخص قوانین خداوندی کے ساتھ کسی اور کے قوانین کو بھی شامل کرے گا اسے اپنے اس مسلک کی تائید میں کوئی دلیل و برہان نہیں مل سکیگی۔ طلوع اسلام کی دعوت یہ ہے کہ اطاعت و فرمانپذیری خالص قوانین خداوندی کی کی جائے۔ اور ان میں انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین کو قطعاً شریک نہ کیا جائے۔ اس دعوت کے مخالفین ان قوانین کے ساتھ اپنے خود ساختہ قوانین کو بھی شامل کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ قرآن کے دعوٰ

کے مطابق انھیں اپنے اس مسلک کی تائید میں علم کی بارگاہ سے کوئی دلیل نہیں مل سکتی جب انھیں دلیل نہیں ملتی تو وہ دھاندلی بازی سے کام لیتے ہیں ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ ایسا انتظام کیا جائے کہ قرآن کا پیغام لوگوں کے کانوں تک پہنچنے نہ پائے۔ وہ ہر ایک سے کہتے ہیں کہ لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ دیکھنا اس کتاب کا ایک لفظ بھی تمہارے کانوں میں پڑنے نہ پائے۔ جہاں اس کا ذکر ہو رہا ہو اَلْغَوْا فِيْهِ اس میں شور مچا دیا کرو۔ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ (۴۱/۲۶) اس سے توقع ہو سکتی ہے کہ تم غالب ہو جاؤ۔ اس سفر میں قرآن کے پیغام کے مخالفین کی طرف سے جو کچھ میں نے دیکھا وہ اسی آیت کی تفسیر تھا اور اس کا آغاز ۱۹ دسمبر کو لاہور ہی میں ہو گیا۔ جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے اسلامیہ کالج کے حبیبیہ ہال میں تقریر کا اعلان ہو چکا تھا۔ اعلان کالج کے ارباب حل و عقد کی منظوری کے بعد کیا گیا تھا لیکن جلسے کے وقت سے کچھ پہلے ان حضرات نے کہلا بھیجا کہ وہ ہال نہیں دے سکتے کیونکہ مخالفین کی طرف سے ان پر دباؤ ڈالا جا رہا ہے۔ اربابِ بزم کا خیال تھا کہ جلسہ کسی دوسرے ہال میں کر لیا جائے۔ لیکن بالآخر طے یہی پایا کہ چونکہ موضوع ایسی نوعیت کا ہے جس کا قوم کے نوجوان طبقے سے خصوصی تعلق ہے اس لئے تقریر پھر کسی تاریخ میں کسی کالج کے ہال میں ہی کی جائے۔ چنانچہ اس فیصلے کے بعد سابقہ پروگرام کے بجائے ایک دوست کے ہاں نجی قسم کا اجتماع ہوا۔ وہاں بات یہ چھڑ گئی کہ انسانی ذات کے خصائص و رجحانات اور اس کے منتہیٰ و مقصود کے متعلق قرآن کیا بتاتا ہے۔ اس سلسلہ میں پرویز صاحب نے قرآن کریم کے جو بلند حقائق فلسفۂ قدیم و جدید کے تقابل میں بیان کئے ان کا اندازہ وہی احباب کر سکتے ہیں جو اس شگفت و شاداب محفل میں شریک تھے۔ سامعین کے قلوب، قرآن کی عظمت کے سامنے بے ساختہ جھکتے چلے جاتے تھے اور وہ حیران و ششدر تھے کہ یہ مختصر سی کتاب اپنے چھوٹے چھوٹے فقروں میں کس قدر دُر شاہوار پوشیدہ رکھتی ہے۔

۲۰ نومبر کی شام کو دیال سنگھ کالج کے وسیع ہال میں پرویز صاحب کی تقریر تھی جس کا عنوان تھا

قوموں کا عروج و زوال ـــــ قرآن کی روشنی میں

تقریر کے وقت ہال میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ خوشی کا مقام یہ تھا کہ اگرچہ موضوع خشک سا تھا لیکن طلبا کثیر تعداد میں موجود تھے۔ تقریر نہایت جذب و انہماک سے سنی گئی کہ کسی کے سانس کی آواز تک سنائی نہیں دیتی تھی۔ تقریر کے بعد سوالات کی دعوت دی گئی تو یہ حقیقت نمایاں طور پر سامنے آئی کہ وہ عنصر جو ایسے جلسوں میں عام طور پر شور مچانے اور بدمزگی پیدا کرنے کے لئے آیا کرتا ہے یا تو وہاں موجود ہی نہ تھا اور اگر موجود تھا تو اسے کسی قسم کی شر انگیزی کی ہمت ہی نہیں ہوئی۔ چنانچہ قرآنی پیغام کی پیدا کردہ خوشگوار فضا میں اس تقریب کا اختتام ہوا۔ اور طلبا نے خاص طور پر اس کا اثر لیا۔ فالحمد للہ علی ذالک۔

سیالکوٹ ۲۱ کی صبح کو ہمارا قافلہ سیالکوٹ کی طرف روانہ ہوا۔ میں یہ کہنا بھول گیا کہ مردان کے ایک دوست نے اس سفر کے لئے موٹر بھیج دیا تھا اور یہ سارا دورہ اسی موٹر میں ہوا۔ یہ واقعہ ہے کہ اگر یہ سفر کار کے بجائے ریل گاڑی میں ہوتا تو اس میں دقت بھی بہت زیادہ لگتی اور پریشانی بھی خاصی ہوتی۔ ہم دوپہر کے قریب سیالکوٹ پہنچ گئے۔ اور محترم صدر صاحب (خان بخت جمال خاں صاحب) کی قیام گاہ پر اترے۔ مقامی بزم طلوع اسلام کا دفتر بھی وہیں ہے۔ مئی ۱۹۵۶ء میں

جب پرویز صاحب سیالکوٹ گئے تھے تو ان کی تقریر مرے کالج کے ہال میں ہوئی تھی۔ اس دفعہ تقریر کا انتظام مسلم لیگ کے دفتر کے وسیع صحن میں کیا گیا۔ شب کو وہاں تقریر ہوئی جس میں پرویز صاحب نے بتایا کہ حضورؐ نبی اکرم شرفِ مجدِ انسانیت کے جس معراجِ کبریٰ پر فائز المرام ہیں اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ انھوں نے یہ بھی واضح کیا کہ فرقہ اہل القرآن کی کس قدر غلط فہمی تھی جو انھوں نے سمجھ لیا کہ رسول کا کام فقط پیغامِ خداوندی کا دوسروں تک پہنچانا ہے اور بس۔ انھوں نے بتایا کہ جس مقدس سینہ کو وحی کا مہبط بننا ہوتا ہے اسے کس طرح اللہ تعالیٰ خاص طور پر تیار کرتا ہے اور وہ خدا سے وحی پا کر عالمِ انسانیت میں کس قدر عظیم انقلاب پیدا کرتا ہے۔ وحی کا پیغام اگر حروف و الفاظ کی صورت میں ہے تو اس کا عملی نقشہ محمد رسول اللہ والذین معہٗ کے نقوشِ قدم میں جھلمل کرتا نظر آئے گا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے اپنے پیغام کے ساتھ حضورؐ کی سیرتِ طیبہ کے درخشندہ گوشوں کو بھی اپنی دفتین میں محفوظ کر لیا ہے جو تمام نوعِ انسانی کے لئے روشنی کے جگمگاتے مینار کا کام دیتے ہیں۔ تقریر کے بعد سامعین میں سے اکثر کا کہنا یہ تھا کہ جس حسن و عظمت سے مقامِ محمدیؐ آج ہماری آنکھوں کے سامنے آیا ہے اس سے پیشتر کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ حضورؐ نبی اکرم کی سیرتِ مقدسہ سے جو والہانہ عشق محترم پرویز صاحب کو ہے اسکی وجہ سے جب بھی وہ اس موضوع پر گفتگو کرتے ہیں تو ان کے الفاظ میں ایک خاص کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ بہت کم ایسا ہوا ہے کہ حضورؐ کا اسمِ گرامی ان کی زبان پر آیا ہو اور ان کی آنکھیں پُرنم نہ ہو گئی ہوں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ اس فرطِ عقیدت کے باوجود قرآن کا دامن کبھی ان کے ہاتھ سے چھوٹنے نہیں پاتا۔

۲ مرکی صبح کو قیامگاہ پر قرآن کا درس ہوا۔ زاں بعد گذشتہ شب کی تقریر کا اثر لئے ہوئے شہر کے اربابِ فکر و نظر نے صبح ہی سے آنا شروع کر دیا۔ اور یہ سلسلہ مسلسل و متواتر جاری رہا۔ مختلف سوالات اور گوناگوں اعتراضات کئے گئے اور شکوک و شبہات کا اظہار ہوا۔ ہر ایک کو اجازت تھی کہ جو وہ چاہے پوچھے۔ ان سب کے جوابات اس قدر اطمینان بخش تھے کہ جو واپس جاتا یہ کہتا ہوا جاتا کہ کس قدر غلط پروپیگنڈہ ہے جو اس شخص اور اس کی تحریک کے خلاف کیا جاتا ہے۔

سہ پہر کو گورنمنٹ زنانہ کالج کے وسیع احاطہ میں کالج کی طالبات اور شہر کی خواتین پر مشتمل ایک اجتماع ہوا جس میں پرویز صاحب نے بتایا کہ قرآن کریم نے عورت کو کیا مقام عطا کیا ہے اور اس کے فرائض و حقوق کیا ہیں۔ یہ اجتماع اس لحاظ سے خاص اہمیت رکھتا تھا کہ اگر ہماری خواتین کے سامنے قرآن کی صحیح تعلیم آ جائے تو وہ قرآنی انقلاب کے لئے بہت زیادہ کام آسکتی ہیں۔ اس لئے کہ آنے والی قوم کی تربیت انہی کی آغوش میں ہونیوالی ہے اور وہ اسی فضا میں پروان چڑھے گی جو ان کے تصورات اور معتقدات نے پیدا کر رکھی ہے۔ اس اجتماع کی اثر گیری کا اندازہ اس امر سے ہوگا کہ سیالکوٹ میں سب سے پہلے خواتین کی بزمِ طلوعِ اسلام کی بنیاد رکھی جا چکی ہے۔ بزمِ طلوعِ اسلام سیالکوٹ اس لحاظ سے درخورِ ہزار تبریک و تہنیت ہے۔

شام کو پھر مسلم لیگ کے دفتر کے وسیع صحن ہی میں پبلک جلسہ ہوا جس میں پرویز صاحب نے سیرتِ نبی اکرمؐ اور آثارِ صحابہؓ سے جستہ جستہ واقعات سامنے لا کر بتایا کہ قرآنی نظام میں انسان کو کس قسم کی صحیح آزادی نصیب ہوتی ہے۔ ایسی آزادی جس میں انسان

صرف قوانین خداوندی کی اطاعت کرتا ہے اور ہر فرد معاشرہ کی تمام ضروریات زندگی بغیر کسی پریشانی کے از خود پوری ہوتی جاتی ہیں۔

جلالپور جٹاں

۲۳ کی صبح ہم جلالپور جٹاں کی طرف روانہ ہوئے۔ سیالکوٹ سے محترم صدر صاحب (خان بخت جمال خاں) بھی شریک سفر ہو گئے۔ اور بزم طلوع اسلام کراچی کے اولین سکریٹری (محترم سعید صاحب) نے بھی اپنے وطن کی سرحد تک مشایعت کی۔

جلالپور جٹاں گجرات سے قریب آٹھ میل کے فاصلہ پر ایک قصبہ ہے۔ جب لاہور میں وہاں کی بزم کے نمائندگان نے پرویز صاحب کو آنے کی دعوت دی تو خیال ہوا تھا کہ ایک مختصر سے قصبہ میں قرآنی فکر کا چرچا مختصر سا ہی ہوگا۔ لیکن ان احباب کا تقاضائے شوق اس قدر شدید تھا کہ ان کی دعوت کو قبول کرنا ضروری سمجھا گیا۔ جلالپور پہونچ کر معلوم ہوا کہ ہے تو یہ ایک قصبہ ہی لیکن ایک عرصہ سے مختلف سیاسی تحریکات اور مذہبی سرگرمیوں کا مرکز بنا رہا ہے۔ اس اعتبار سے اس مقام میں قرآنی فکر کا چرچا خاص اہمیت رکھتا تھا اراکین بزم نے بتایا کہ ہم یہاں صرف پانچ چھ افراد ہیں۔ لیکن ان میں سے ایک کے منہ سے ایسی بات نکلی جس سے یہ حقیقت واضح طور پر سامنے آگئی کہ زندگی اور حرارت کے لئے تعداد کے مقابلہ میں کیریکٹر کی پختگی کس قدر زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ اس نے کہا کہ ہم ہیں تو پانچ چھ ہی لیکن ہماری "الف بین قلوبکم" کی کیفیت یہ ہے کہ جہاں بھی ہم میں سے کوئی ایک ہو وہاں باقی ماندہ دوستوں کو پورا پورا اطمینان ہوتا ہے کہ ہمارا ہر قسم کا مفاد اور ہر قیمتی قدر اسکے ہاتھوں میں بالکل محفوظ ہے۔ اور اسی میں ہماری قوت کار راز ہے کتنی بلند بات تھی جو اس دوست نے ایسے سادہ سے الفاظ میں کہدی! حقیقت یہ ہے کہ جیسا کہ ایک روایت میں آتا ہے مسلمان وہی ہے جس کے ہاتھ میں دوسرے بھائیوں کا ہر مفاد محفوظ ہو۔ اپنی رفیقوں کی اس یگانگت کا نتیجہ تھا کہ جلالپور جیسے قصبہ میں شدت مخالفت کے باوجود قرآن کا یہ دیا اس تابانی سے روشن تھا۔ ہمارے پہنچنے سے پہلے ہی احباب کا ایک گروہ منتظر تھا۔ پہنچتے ہی مختلف عنوانات پر سوالات کا سلسلہ شروع ہو گیا اور جب لوگ نماز مغرب کے لئے اٹھے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا تھا گویا شک و شبہات کے بہت سے بادل چھٹ گئے ہیں۔ رات کو اسلامیہ اسکول کے ہال میں جلسہ عام ہوا۔ پرویز صاحب کی تقریر حسب معمول بڑی مدلل فلسفہ موثر تھی۔ تقریر کے بعد سوالات کے لئے کہا گیا۔ اگرچہ بزم طلوع اسلام کے اراکین کو اس کا خیال تھا کہ مخالفین کی طرف سے اعتراضات کی بوچھاڑ ہوگی۔ لیکن ان کی اور ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی جب یہ دیکھا کہ مخالفت کی کوئی ایک آواز بھی نہ اٹھی۔ حقیقت یہ ہے کہ (جیسا کہ میں نے شروع میں کہا ہے) مخالفین کی چال (STRATEGY) ہی یہ ہوتی ہے کہ لوگوں کے کانوں تک قرآن کی آواز نہ پہنچنے پائے لیکن جب وہ اس میں ناکام رہتے ہیں اور لوگوں تک قرآن کا پیغام پہنچ جاتا ہے تو ان میں ہمت ہی نہیں رہتی کہ سامنے آسکیں قرآن کی روشنی ہر تاریکی پر غالب آجاتی ہے۔ جلسے کے بعد بہت سے حضرات قیام گاہ پر آگئے اور وہاں قریب آدھی رات گئے تک باتیں ہوتی رہیں۔ جن میں زیادہ حصہ محترم صدر صاحب نے لیا جو ہم سب کے مقابلے میں زیادہ جواں ہمت ہیں۔

پشاور

۲۴ کی صبح کو ہم نہایت خوشگوار اثرات لئے ہوئے جلالپور سے روانہ ہوئے۔ پروگرام کے مطابق ہمیں اسی شام پشاور پہنچنا تھا۔

جیسا کہ احباب کو معلوم ہے پرویز صاحب کی صحت کراچی میں ہمیشہ خراب رہتی ہے۔ اور یہ چیز ہم تمام رفقاء کے لئے بڑی پریشانی کا موجب ہوتی ہے۔ یہ تو اُن شدید احتیاطوں اور پابندیوں کا نتیجہ ہے جو انھوں نے اپنے آپ پر عائد کر رکھی ہیں جو وہ اس کے باوجود اس قدر زیادہ کام کرتے رہتے ہیں۔ ورنہ ہم ان کی طرف سے کبھی مطمئن نہیں ہوتے۔ کنونشن کے سلسلہ میں ہماری یہ تشویش اور بھی بڑھ گئی تھی کہ وہ اپنے معمول کے علی الرغم اس قدر تگ و تاز اور دستاخیز کو کس طرح برداشت کر سکیں گے لیکن ہماری حیرت اور اسکے ساتھ ہی مسرت کی انتہا نہ رہی جب ہم نے دیکھا کہ انھوں نے کس ہمت اور توانائی سے کنونشن کے پُر ہجوم پروگرام کو تکمیل تک پہنچایا۔ کنونشن کے بعد اس سفر کے سلسلہ میں بھی ہمیں بڑی تشویش تھی لیکن ہم دیکھ رہے تھے کہ اس قدر تھکا دینے والے سفر اور مصروف پروگرام کے باوجود ان پر تکان کا کوئی اثر نہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی زندگی اس مقصد میں اس قدر سمو گئی ہے کہ مقصد میں انہماک ان میں خاص توانائی پیدا کر دیتا ہے۔ یہی وہ توانائی تھی جس سے وہ اتنے لمبے لمبے سفر اس اطمینان اور خندہ پیشانی سے کئے جا رہے تھے ہم رات کو آٹھ بجے کے قریب پشاور پہنچ گئے۔

کنونشن میں پشاور سے صرف دو دوست شریک ہوئے تھے۔ مرزا علی احمد صاحب اور مرزا نصیر الدین صاحب۔ انھوں نے لاہور ہی میں بتا دیا تھا کہ پشاور میں مخالفت سخت ہے اور موافقت میں گنتی کے چند افراد ہیں۔ اس لئے وہاں کی دعوت صرف قلبہ رائی اور تخم کاری کے لئے سمجھی جائے۔ مخالفت کا یہ عالم تھا کہ جب ان حضرات نے چاہا کہ مقامی اخبار میں ہماری آمد کی خبر شائع ہو جائے تو پہلے تو اس سے صاف انکار ہو گیا اور جب خاص اصرار کے بعد یہ خبر شائع ہوئی بھی تو بایں نمط کہ اخبار کے آخری صفحہ پر بغیر کسی عنوان یا سرخی کے کالم کے ایک گوشے میں، یہ بیچاری اس طرح دبکی ہوئی بیٹھی تھی۔

چو زاہدے کہ بہ بزم شراب می آید

نظام یہ تھا کہ صبح کو قیام گاہ کے باہر کھلے احاطہ میں ان احباب سے خطاب کیا جائے جنھیں انفرادی طور پر دعوت دی گئی تھی۔ لیکن صبح اٹھتے ہی دیکھا گیا کہ وہاں "الخوفیہ" کا سلسلہ شروع ہے۔ مخالفین میں سے ایک صاحب نے اپنے ریڈیو کے ساتھ لاؤڈ اسپیکر چپکا دیا تھا۔ جس کا شور سارے احاطہ کو سر پر اٹھا رہا تھا۔ مجبوراً یہ اجتماع اپنے ہی صحن خانہ تک محدود رکھنا پڑا۔ اجتماع مختصر لیکن شستہ تھا۔ اثر اس کا یہ تھا کہ اس کے فوراً بعد طے پایا کہ سہ پہر کو اسی انداز کا اجتماع ایک اور دوست کے ہاں کیا جائے۔ دوسرا اجتماع پہلے اجتماع کے مقابلے میں کہیں زیادہ تھا۔ پہلے اجتماع کی خبر شہر میں پھیل گئی تھی۔ اور مختلف اطراف و جوانب سے ملنے والوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا جو رات کے کھانے تک جاری رہا۔ اس طرح پشاور کی برفانی سلوں کو توڑ کر قرآنی آواز کے لئے راستہ تراشا گیا۔ لیکن جب راستہ بن گیا تو وہاں سے چشموں کا بہہ نکلنا کچھ مشکل نہ تھا۔ چنانچہ جب اگلی صبح کو وہی اخبار سامنے آیا جس کا ذکر کیا جا چکا ہے تو اس میں پہلے ہی صفحہ پر اعلیٰ سرخی کے نیچے اجتماع دیروزہ کا ذکر اس حسن و خوبی سے کیا گیا تھا جو قرآنی اجتماعات کے شایانِ شان ہو سکتی ہے یہ پشاور کے احباب کے خلوص و محبت اور ہمت و استقلال کا نتیجہ تھا۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ ایک مقامی کالج کے طلباء کی طرف سے یہ تقاضہ موصول ہوا کہ دوپہر کو پرویز صاحب ان سے خطاب کریں۔ لیکن چونکہ دوپہر کے لئے پہلے سے مردان کا پروگرام طے پا چکا تھا

اس لئے ان عزیزوں کے تقاضۂ شوق کو دوسرے وقت پر ملتوی رکھ کر ہم ۲۶ر کی صبح کو مردان روانہ ہو گئے۔

مردان

قارئین کو معلوم ہے کہ مردان کی بزم پہلے نمبر پہ ہے۔ مخلص، درپردہ کام کرنے والے خاموش احباب کی ایک بنیانِ مرصوص جو قرآن کے جذبہ سے سرشار ہیں۔ ہنستے ہنستے چہرے ہوئے قدم، بڑھتے ہوئے ہاتھ۔ سینے روشن۔ ٹھنڈے سر۔ لیکن ان کے مقابلہ میں مخالفت بھی سخت و سنگین۔ ایسی سنگین کہ اس سے پہلے وہاں کوئی پبلک اجتماع ممکن نہ ہو سکا۔ اس مرتبہ مقامی کالج کے پرنسپل صاحب رضامند ہو گئے کہ پرویز صاحب طلباء سے خطاب کریں۔ لیکن بعد میں انھوں نے انکار کر دیا۔ ہمیں تو اس سے کچھ افسوس سا ہوا لیکن ان احباب کے روحِ رواں (یادش بخیر ڈاکٹر ایم خاں صاحب) اس سے بالکل متاثر نہیں ہوئے۔ انھوں نے اپنے فطری تبسم کے ساتھ فرمایا کہ کچھ بات نہیں؛ یہ خود اپنے اس فیصلہ پر متاسف ہوں گے۔

مردان میں شروع ہی سے یہ انداز چلا آتا ہے کہ پرویز صاحب کی آمد کی خبر علاقہ میں پھیل جاتی ہے اور بیس بیس، تیس تیس میل دور سے احباب خیل در خیل آنے شروع ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ یہی سلسلہ اب بھی شروع ہو گیا۔ اور صبح سے رات تک قرآنی فکر و تصورات کی جوئے نور مسلسل جاری رہی۔ کس قدر جاں پرور و حیات بخش تھی یہ فضا جس میں ہر سمت سے قرآن کی آواز فردوس گوش بن رہی تھی۔

ڈاکٹر ایم خاں صاحب (اور ان کے دیگر رفقاء) کے حسن تدبر نے ایسی صورت پیدا کر دی کہ ۲۷ر کی شام کو مردان کلب کے ہال میں ایک ایسا اجتماع ہوا جو مردان کی تاریخ میں یادگار رہے گا۔ اس اجتماع میں مردان کے قریب قریب تمام اعلیٰ افسران وکلاء، پروفیسر، تعلیم یافتہ طبقہ کا منتخب گروہ شامل تھا۔ مخالفین بھی اچھی خاصی تعداد میں موجود تھے جن کی وجہ سے بعض چہروں پر پریشانی کے آثار دکھائی دیتے تھے اسلئے کہ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ فتنہ پردازی کا کونسا پروگرام دل میں لئے کر آئے ہیں۔ جو لوگ دین کی خدمت کے لئے جائز و ناجائز ہر حربہ کو عین جہاد سمجھتے ہیں، ان سے سب کچھ ممکن ہو سکتا تھا۔ ان حالات میں پرویز صاحب تقریر کے لئے اٹھے اور قرآن کا اعجاز دیکھئے کہ قریب ڈیڑھ گھنٹہ کی تقریر میں کسی طرف سے کھانسنے تک کی آواز بھی نہ آئی۔ اس کے برعکس اکثر آنکھیں تھیں جو اشکبار تھیں اور بیشتر سر تھے جو احترام سے نگوں تھے۔ تقریر کے بعد چاروں طرف سے تبریک و تہنیت کے غلغلے بلند ہوئے اور متفقہ طور پر کہا گیا کہ ہمیں افسوس ہے کہ مخالفین کی طرف سے اس قدر جھوٹ بولا گیا کہ ہم ان کے فریب میں آ گئے تھے اور اسلئے پہلے اس قسم کے قرآنی حقائق و معارف سے مستفید ہونے سے محروم رہے۔ ان متاسف ہونیوالوں میں وہ حضرات بھی شامل تھے جن کی وجہ سے کالج میں تقریر نہیں ہو سکی تھی۔ بحمد اللہ کہ مردان کا یہ اجتماع اس حسن و خوبی سے اختتام تک پہنچا۔ اس کامیابی کا نتیجہ یہ ہوا کہ قیام گاہ پر شہر کے ارباب فکر و نظر کا تانتا بندھ گیا۔

قرآن کے مخالفین کا یہ اندیشہ بجا ہے کہ اگر کسی کے کانوں تک قرآن کی آواز پہنچ گئی تو اس کا متاثر ہوئے بغیر رہنا ناممکن ہے یہی وجہ ہے کہ وہ کوشش کرتے ہیں کہ قرآن کی آواز کوئی سننے ہی نہ پائے!

راولپنڈی

۲۸ر کی صبح کو ہم عازم راولپنڈی ہوئے۔ اور ہمارے ساتھ ہی بزم طلوع اسلام مردان کے نمائندگان بھی

راولپنڈی تشریف لائیے۔ کس قدر محبت کے پیکر ہیں یہ احباب!

راولپنڈی میں بھی قرآنی پیغام کی مخالفت کم نہ تھی۔ چنانچہ اس سے قبل جب بھی پرویز صاحب وہاں تشریف لے گئے ہیں تو اہل بزم کی سعی بسیار کے باوجود پبلک اجتماع کا انتظام نہیں ہو سکا تھا۔ صرف ایک دوست کے ہاں (الکوثر میں) اجتماعات ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ تو ملا ہوا ہال بھی چھن گیا تھا۔ لیکن اس مرتبہ گارڈن کالج کے ہال میں جلسہ کا انتظام ہوا اور ریڈیو پاکستان سے اعلان۔ فضا کس قدر قرآنی پیغام کے لئے سازگار ہو رہی ہے! شب کو جلسہ ہوا۔ تقریر بڑے انہماک سے سنی گئی۔ اور جلسہ کے بعد قرآن سے شغف رکھنے والے احباب نے دیر تک پرویز صاحب کو گھیرے رکھا۔ مخالفین میں سے کسی کو اعتراض کی جرأت نہ ہوئی۔ اعتراض ہو بھی کس بات پر سکتا تھا؟ کس کی ہمت ہے کہ قرآن کے خلاف دلیل کی بنا پر آواز اٹھائے!

راولپنڈی کے احباب بھی خلوص و محبت میں یگانہ ہیں۔ ان کے یہ جذبات الوداعی اجتماع کے وقت چھلک کر اوپر آجاتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے جس گرمجوشی سے استقبال کیا تھا۔ اسی سوز و گداز سے الوداع کہا۔ ان کے ساتھ ہی مردان کے احباب سے بھی ہم باچشم نم رخصت ہوئے۔

ماں کے سلام کے لئے

راولپنڈی سے چلے تو راستہ میں وہ گاؤں پڑتا تھا۔ جہاں پرویز صاحب کی والدہ محترمہ اور ہمشیرہ قیام پذیر ہیں۔ مشرقی پنجاب کی تباہی کے بعد پرویز صاحب، تو سلسلہ ملازمت کراچی آگئے تھے اور ان کے اعزہ اس گاؤں میں قیام پذیر ہو گئے تھے۔ پرویز صاحب اس تمام عرصہ میں یہاں شاید ایک دو مرتبہ گئے ہونگے ان کی مصروفیات انہیں باہر نکلنے کی اجازت ہی نہیں دیتیں۔ اب جو ادھر سے گذرنا ہوا تو انھوں نے والدہ کے سلام کے لئے گاؤں میں حاضر ہونا ضروری سمجھا۔ چنانچہ ہم ۲۹ کی شام کو گاؤں پہنچ گئے گئے تو تھے صرف والدہ کے سلام کے لئے لیکن معلوم ہوا کہ گوجرانوالہ تک کے احباب شوق جمع ہیں۔ چنانچہ رات گئے تک ان سے گفتگو رہی اور پچھلی رات کا باقیماندہ وقت ماں اور بیٹے کے حصہ میں آیا

گاؤں سے چل کر ۳۰ کی سہ پہر کو ہم لاہور واپس پہنچ گئے۔ اور شام کو اربابِ بزم اسی جذب و شوق اور ہمت و ولولہ کے ساتھ پھر جمع ہو گئے۔ سفر کے کوائف اور نتائج نے احباب کی آنکھوں میں چمک پیدا کر دی بالخصوص اس لئے کہ وہ انہی کی ان کوششوں کا صدقہ تھے جن کی وجہ سے کنونشن کا انعقاد عمل میں آیا تھا۔

یکم دسمبر کی شام، دیال سنگھ کالج کے ہال میں، وہ ملتوی شدہ جلسہ ہوا جس کا ذکر شروع میں کیا جا چکا ہے۔ موضوع سخن تھا۔

جنسیات کا اثر قوموں کے کلچر پر

ہال سامعین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ تعلیم یافتہ طبقہ بالخصوص کالج کے طلباء کشاں کشاں آگئے تھے۔ ڈیڑھ گھنٹہ کی تقریر میں ایسا محسوس ہو رہا تھا گویا خود سامعین کی ذہنی سطح بلند سے بلند تر ہوتی جا رہی ہے۔ عفت و عصمت کے متعلق قرآن کے قوانین۔ ان کی اہمیت اور دورِ حاضر کے محققین و مکتشفین کی تحقیقات کی روشنی میں ان کی تائید۔ بہت ہی بصیرت افروز اور حقیقت کشا انداز میں سامنے آرہی تھی۔ تقریر کے بعد صدرِ جلسہ محترم شیخ عبدالحق صاحب نے فرمایا کہ اگر پرویز صاحب اس تقریر کو قلمبند کر کے بھجوا دیں تو وہ

اسے کالج میگزین میں چھپوائیں گے اور اپنے خرچ پر پمفلٹ کی صورت میں بھی شائع کر کے اسے قوم کے نوجوان طبقہ تک زیادہ سے زیادہ تعداد میں پہنچانے کا انتظام کریں گے۔ یہ جلسہ کالج کے ہسٹاریکل سوسائٹی کے زیر اہتمام منعقد ہوا تھا۔ چنانچہ سوسائٹی کے سکرٹری صاحب نے کہا کہ پمفلٹ کو زیادہ سے زیادہ طلبا تک پہنچانے کا انتظام سوسائٹی کریگی۔ اس کے بعد پرویز صاحب سے اس کا وعدہ لیا گیا کہ وہ جب کبھی لاہور آئیں گے تو دیال سنگھ کالج کے "حق" کو فراموش نہ کریں گے۔ طلبا نے اصرار کیا کہ آئندہ پرویز صاحب کے توسیعی لیکچر بھی ہوا کریں۔ بعض طلبا نے اپنے آپ کو تربیتی مرکز میں زیر تعلیم و تربیت رہنے کے لئے پیش کیا۔ غرضیکہ نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ اس لیکچر سے ایسا گہرا اثر لے کر گیا جو جلدی سے محو نہیں ہو سکتا۔ یہی طبقہ درحقیقت قرآنی پیغام کا اولیں مخاطب ہے۔ اور ان کے دلوں تک قرآن کے پیغام کا اس طرح پہنچ جانا اور رس نتائج کا حامل ہو سکتا ہے۔

منٹگمری منٹگمری میں بزم کا قیام حال ہی میں عمل میں آیا تھا اور کنونشن کے موقعہ پر وہاں سے دو احباب تشریف لائے تھے ایک چودھری عطاء اللہ صاحب (پلیڈر) اور دوسرے کمسن سال نوجوان ہمت غلام احمد خاں جالندھری۔ انھوں نے جب منٹگمری آنے کی دعوت دی تو ہم نے یہی سمجھا تھا کہ اس سے ان احباب کی ہمت افزائی ہو جائے گی۔ لیکن جب لاہور میں ان کی طرف سے پروگرام موصول ہوا تو ہم ایک طرف، خود اربابِ لاہور کو رشک تھا کہ منٹگمری کی بزم ہم سے بھی آگے بڑھ رہی ہے! ہم ۲ر دسمبر کی سہ پہر کو منٹگمری پہنچ گئے۔ طلوع اسلام کے السابقون الاولون میں سے ڈاکٹر عبدالقادر خاں صاحب سے ملاقات ہوئی۔ یہ بڑے مخلص دوست ہیں۔ اسی شام کو روٹری کلب میں اجتماع ہوا۔ وہاں کے مختصر لیکن نہایت شستہ اجتماع میں علم کے عنوان پر تقریر ہوئی۔ جلسہ کے اختتام پر عام ریمارکس یہ تھے کہ ہمیں اس کا علم ہی نہ تھا کہ قرآن کریم علم کی دنیا میں اتنے بلند حقائق پیش کرتا ہے! اس اجتماع میں البتہ ایک خامی محسوس ہوئی جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ تقریر میں پرویز صاحب نے قرآن کی ایک آیت میں "جن و انس" کا ترجمہ "شہری اور دیہاتی آبادیاں" کیا۔ اور دوسرے مقام پر آدم کو نوعِ انسانی کا ترجمان بتایا۔ ان امور کی تشریح ان کی کتاب "ابلیس و آدم" میں کی جا چکی ہے۔ تقریر کے بعد دو ایک نوجوانوں نے اصل موضوع کو نظر انداز کر کے صرف انہی نکات کو سامنے رکھا اور ان پر اعتراض شروع کر دیئے۔ پرویز صاحب نے بھی کہا اور صدر صاحب نے بھی کہ یہ نکات ایسے ہیں جن پر تفصیلی گفتگو کی ضرورت ہے اور ضمناً ان کے متعلق اطمینان بخش طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن وہ اپنے اعتراضات کو برابر دہراتے رہے۔ حتیٰ کہ وہ اس پر بھی رضامند نہ ہوئے کہ ان امور کی تشریح پہلے "ابلیس و آدم" میں دیکھ لیں۔ اور اس کے بعد اگر ضرورت ہو تو مزید دریافت کی کاوش کریں۔ میں نے اس واقعہ کا ذکر اسلئے ضروری سمجھا ہے کہ علمی مباحث میں یہ انداز کسی صورت میں نفع بخش نہیں ہو سکتا۔ اور متلاشیان حقیقت کو ہمیشہ اس پہلو کا خیال رکھنا چاہیئے۔

۳ر دسمبر کی سہ پہر کو بار ایسوسی ایشن کی طرف سے دعوت تھی۔ اس سنجیدہ اجتماع میں علاوہ وکلاء کے، دیگر حضرات ایسے بھی شریک تھے جن کا تعلق قانون سے تھا۔ اس نسبت سے تقریر کا موضوع ہوا "اسلامک کانسٹی ٹیوشن"۔ اس موضوع پر پرویز صاحب کا نقطۂ نگاہ قارئین طلوع اسلام سے پوشیدہ نہیں۔ لیکن وہاں کے اجتماع میں یہ چیز بالکل نئی تھی۔ تقریر چونکہ مدلل اور قرآنی تائیدات سے مستند

تھی۔ اس لئے اس کا اثر بڑا حقیقت کشا ثابت ہوا۔ سوالات بھی موضوع سے متعلق تھے اور اچھے سلجھے ہوئے تھے۔ عصرانہ کے بعد یہ تقریب ختم ہوئی۔

رات کو ایک عام جلسہ ہوا جس کی صدارت وہاں کے ڈپٹی کمشنر (مسٹر سی جعفری) نے کی۔ اجتماع کثیر بھی تھا اور اُجلا بھی۔ تقریر کا موضوع مقامِ محمدی تھا۔ جس کے ضمن میں نظامِ ربوبیت کی ایک جھلک بھی سامنے آگئی تھی۔ یہ تقریر بڑی موثر اور بصیرت افروز تھی اس نے اپنے پیچھے نہایت خوشگوار نقوش چھوڑے جن کا تذکرہ دوسرے دن متواتر ہوتا رہا۔

سہ پہر کو ایک دلچسپ تقریب ہوئی۔ یہ ایک نئی قسم کا اجتماع تھا۔ جس میں ہر شخص کو اجازت تھی کہ وہ جو سوال چاہے دریافت کرے۔ چنانچہ روح کے مسئلہ سے لے کر انسانی ذات کے منتہیٰ اور نکاح و طلاق کے مسائل سے لے کر ذات و صفات خداوندی کے شئون تک مختلف گوشوں سے متعلق سوالات سامنے آئے اور ایک ایک کے متعلق قرآن کی روشنی میں نہایت وضاحت سے جواب دیئے گئے۔ یہ پر مغز اور شگفتہ محفل اس وقت تک قائم رہی، جب تک ہماری گاڑی کا وقت نہیں ہوگیا۔ چنانچہ وہاں سے سیدھے اسٹیشن پر آگئے (موٹر ہم نے منٹگمری سے واپس بھیج دیا تھا) اور شام کے سات بجے کے قریب تیز گام میں سوار ہو گئے۔ گاڑی کے روانہ ہونے تک سوالات کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ چنانچہ انہی حسین مذاکرات کی فضاؤں میں ہم نے منٹگمری کے احباب کو الوداع کہا

نگہ بازگشت

تیز گام۔ اہم بات کی۔ فراٹے بھرتی ہوئی جارہی تھی۔ گذشتہ تین ہفتہ تک کے کوائف ایک ایک کر کے میری آنکھوں کے سامنے سینما کے فلم کی طرح آرہے تھے۔ دو باتیں بالکل نمایاں تھیں۔ ایک تو یہ کہ پرویز صاحب سے میرے تعلقات قریب تیس برس سے ہیں۔ اس تمام دوران میں ان کے خیالات۔ ان کے قرآنی تصورات۔ طلوعِ اسلام اور اس کے مشن سے مسلسل وابستہ رہا ہوں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب ان خیالات کی ابتداء ہوئی تھی تو یہ آواز کس قدر نامانوس اور غریب الدیار تھی لیکن اس ایک فرد کے قرآن سے والہانہ عشق۔ کوہکن کی سی محنت اور بے پناہ استقامت نے آج یہ کیفیت پیدا کردی ہے کہ خیبر سے لے کر کیماڑی تک کوئی شہر۔ کوئی قصبہ۔ کوئی گاؤں۔ کوئی کوچہ ایسا نہیں جس تک یہ آواز نہ پہنچ چکی ہو اور دوسری بات یہ کہ قرآنی نظام کے متعلق جو کچھ اس وقت تک کہا جا چکا ہے وہ کم نہیں ہے اب ضرورت یہ ہے کہ اس کی اشاعت کو زیادہ سے زیادہ وسیع کیا جائے۔ بس یہی ایک کام کرنے کا ہے۔ اگر ہم نے یہ کام کر دیا تو پھر اس نظام کے متشکل ہو کر سامنے آجانے میں زیادہ دیر نہیں لگ سکتی۔ دنیا اس نظام کے لئے بے حد تشنہ ہے۔

یہ تھے وہ خیالات جن میں مستغرق تھا کہ ۵ دسمبر کو ۱۰ بجے کے قریب کراچی چھاؤنی کا اسٹیشن آگیا۔ جہاں قرآنی احباب اپنی مخصوص خندہ پیشانی کے ساتھ موجود تھے۔ رفقاء کو بخیریت دیکھ کر خوشی ہوئی۔ اور اس امر سے بے حد اطمینان کہ پرویز صاحب اس قدر طویل طویل سفر اور ایسے پر ہجوم پروگرام کو بحسن و خوبی تکمیل تک پہنچا کر بعافیت واپس آگئے۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک

لیکن معلوم ہوا کہ ان کی یہ خیریت صرف اس جذبِ انہماک کی وجہ سے تھی جو اپنے مقصد کی تکمیل کے سلسلہ میں ان کو اس طرح محیط تھی۔ کیونکہ یہاں پہنچ کر اگلی ہی صبح کو ان کی طبیعت ناساز ہو گئی۔ اور ان سطور کے سپردِ قلم کرنے تک وہ علیل ہیں اگرچہ

اب حالت نسبتاً بہتر ہے۔

یہ ہیں کنونشن کے بعد کے کوائف و تاثرات جنھیں میں نہایت مختصر الفاظ میں پیش خدمت کر سکا ہوں۔ بعد از سپاس گذاری ہوگا اگر میں اپنی طرف سے اور اپنے دیگر رفقائے سفر (منجملہ پرویز صاحب) ان احباب کا دلی شکریہ ادا نہ کروں۔ جنھوں نے اس سفر میں ہمارے راحت و آرام کا اس قدر خیال رکھا اور سفر کے اس مقصد کو کامیاب بنانے میں اس قدر زحمت اٹھائی۔

چند احباب کے نام نامی برسبیل تذکرہ اوپر آ چکے ہیں۔ ورنہ بحمداللہ ان رفقاء کی فہرست طول طویل ہے۔ مثال کے طور پر لاہور میں محترم چودھری عبدالرحمن صاحب۔ عبداللطیف نظامی صاحب۔ افتخار احمد صاحب۔ مرزا محمد خلیل صاحب۔ عبدالرؤف صاحب۔ ڈاکٹر احمد حسن صاحب۔ ڈاکٹر عبدالودود صاحب وغیرہم۔ سیالکوٹ میں محمد سبحانی و فیض احمد صاحبان اور ان کے ساتھی۔ جلالپور میں مرزا غلام حسین صاحب اور ان کے رفیق۔ پشاور میں ڈاکٹر یوسف علی اور ضیا صاحبان۔ مردان میں ڈاکٹر آر۔ ایم خاں صاحب۔ ڈاکٹر عبدالحکیم صاحب۔ ڈاکٹر انور صاحب۔ مولانا عبدالحی صاحب اور مستری محمود صاحب۔ راولپنڈی میں عزیز احمد قریشی صاحب فیروز علی بھٹی صاحب۔ قدرت اللہ صاحب۔ آصف صاحب اور راولپنڈی بزم کے جواں ہمت سکریٹری مع دیگر رفقائے کار۔ ان سب کی یاد ہمارے لئے بہترین تحفہ ہے۔ ہاں محترم بشیر عزیز صاحب کا نام تو رہ ہی گیا۔ جنھوں نے کنونشن میں شرکت کے بعد منٹگمری کے اجتماعات میں بھی اوکاڑہ سے تشریف لا کر شرکت کی۔

ایک معذرت

بعض دوستوں نے کنونشن کے بعض مناظر کی تصاویر کھینچ لی تھیں۔ کنونشن کے بعد بعض احباب نے مشورہ دیا کہ ان تصاویر کو طلوع اسلام میں شائع کیا جائے۔ تاکہ کنونشن کے تاثرات جو الفاظ و حروف کی شکل میں محفوظ کئے گئے ہیں۔ آثار و نقوش کے رنگ میں محفوظ ہو جائیں۔ اور اس اعتبار سے طلوع اسلام کا کنونشن نمبر یادگار بن جائے۔ مشورہ عمدہ تھا اسلئے وہیں سے تصاویر کراچی بھیج دی گئیں تاکہ ان کی مناسب درستی کے بعد انھیں کنونشن نمبر میں شائع کر دیا جائے۔ جب ہم منٹگمری پہنچے ہیں تو طلوع اسلام کا کنونشن نمبر ملا اور یہ دیکھ کر بیحد رنج ہوا کہ اس میں تصاویر ایسی خراب چھپی ہیں جو طلوع اسلام کے قطعاً شایانِ شان نہیں۔ ہم قارئین کے حسن نظر اور جن احباب کی تصاویر اچھی نہیں شائع ہوئیں ان کی نزاکتِ احساس سے معذرت خواہ ہیں کہ جس کوشش کے متعلق اندازہ تھا کہ وہ ان کے ذوقِ لطیفہ کے لئے وجہِ شادابی ہوگی، وہ الٹا باعثِ تکدر بن گئی ــــ اتفاقات ہیں زمانے کے۔

کسی دوسرے موقعہ پر تلافی کی کوشش کی جائے گی۔ والسلام۔

ایک اعلان

دو پیشگی خریدار صاحبان نے لاہور میں کنونشن بکسٹال سے چند کتب اپنے حساب میں لی تھیں۔ یہ کتب جس سلپ پر نوٹ کی گئی تھیں وہ اتفاق سے گم ہو گئی ہے۔ لہٰذا وہ براہِ مہربانی بذریعہ پوسٹ کارڈ مطلع فرمائیں تاکہ اندراج ہو سکے۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام۔

رابطہ باہمی

مرکزی بزم طلوع اسلام کراچی

ڈاکٹر حبیب الرحمٰن خاں صاحب صدر مرکزی بزم طلوع اسلام کراچی تحریر فرماتے ہیں۔ کہ طلوع اسلام کنونشن لاہور کی قراردادوں پر جو دسمبر کے طلوع اسلام کے صفحات ۱۴ تا ۱۶ شائع ہو چکی ہیں مرکزی بزم طلوع کراچی نے حسب ذیل کارروائی کی۔

(۱) (قرارداد ۲) سالانہ چندہ:۔

جملہ اراکین بزم کراچی نے اپنے اپنے ماہانہ چندہ کا تعین کر دیا ہے اور ادائیگی شروع ہو گئی ہے۔

(۲) (قرارداد ۳) کراچی کے قرآنی احباب کا نام بدل کر بزم طلوع اسلام کراچی رکھ دیا گیا ہے۔

(۳) (قرارداد ۵) حلقہ دار کمیٹیاں:۔

بزم کراچی کی علاقہ دار کمیٹیاں پہلے سے قائم ہیں۔ ان میں خدمت خلق کی ایسی شکلوں پر غور کیا جا رہا ہے جنھیں اجتماعی آسانی سے عمل میں لایا جا سکے

(۴) (قرارداد ۶-۷-۹-۱۰) مرکزی بزم کراچی نے نشر و اشاعت کے لئے ایک کمیٹی مقرر کر دی ہے۔ جو اس اہم فریضہ کے مختلف گوشوں کو ایک ایک کر کے اپنے سامنے رکھے گی۔

(۵) (قرارداد ۱۱) بزم خواتین:۔ کراچی میں بزم خواتین قائم کرنے کے لئے کوششیں شروع کر دی گئی ہیں۔

(۶) (آخری قرارداد) عملی نمونہ:۔ اس پر عمل درآمد شروع کر دیا گیا ہے۔

(۷) مندرجہ بالا ریزولیوشنز کے علاوہ ایک چیز اور بھی قابل ذکر ہے۔ ایک "مجلس رابطہ" قائم کی گئی ہے۔ اس کے اراکین تعلیم یافتہ طبقہ اور خاص طور پر طلباء سے مل کر ان سے رابطہ قائم کریں گے۔ اور انھیں قرآنی فکر سے قریب تر لا کر اپنا ہم خیال بنائیں گے۔ کیونکہ ہمارے خیال میں اس ملک کے مستقبل کا بڑی حد تک انحصار انھیں طلباء اور تعلیم یافتہ نوجوان طبقہ پر ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ان کی فکری تربیت کر دی جائے۔

(۸) مختلف اضلاع کی بزموں سے گزارش ہے کہ وہ اپنے مشوروں سے مرکزی بزم کو مستفید کریں۔ اور جن امور میں کوئی مشکل پیش آئے۔ اس کی بابت مرکزی بزم کو لکھیں۔ ان امور میں ہیں کوتاہی نہیں برتنی چاہیئے۔ خط و کتابت کے لئے یہ پتہ کافی ہوگا۔

ڈاکٹر حبیب الرحمٰن خاں صاحب۔ صدر بزم طلوع اسلام۔ ۱۵۹/۳۔ ایل (پی۔ ای۔ سی ہاؤسنگ سوسائٹی) کراچی ۲۹

بزم سیالکوٹ

محمد سبحانی صاحب سیالکوٹ سے تحریر فرماتے ہیں کہ میں مسرت و کامرانی کے ملے جلے جذبات کے تحت اطلاعاً عرض کرنا چاہتا ہوں کہ طلوع اسلام کنونشن

کی قرارداد علاء پر لبیک کہتے ہوئے اور محترم پرویز صاحب کی سیالکوٹ میں تشریف آوری پر ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہوئے ہم نے یہاں خواتین کی بزم کا انعقاد ۲۳ نومبر ۱۹۵۶ء کو بروز جمعہ کر دیا ہے۔ اور محترمہ بیگم ریاض شیخ صاحب کو اس کا ترجمان بھی بنا دیا گیا ہے۔

بزم ہنگو ضلع کوہاٹ محمد اصیل صاحب آشفتہ گورنمنٹ ہائی اسکول ہنگو ضلع کوہاٹ ترجمان بزم طلوع اسلام تحریر فرماتے ہیں کہ

بزم طلوع اسلام ہنگو کی باقاعدہ تشکیل ۳۰ نومبر ۱۹۵۶ء کو عمل میں آئی اور تیرہ حضرات پر مشتمل ایک کمیٹی نامزد کی گئی ہے۔ جو دیگر احباب سے باہمی رابطہ قائم کرے گی۔

بزم دیونہ منڈی چوہدری محمد اکبر صاحب دکاندار سکریٹری بزم طلوع اسلام دیونہ منڈی ڈاک خانہ دیونہ جلیانی تحصیل و ضلع گجرات تحریر فرماتے ہیں کہ

ہم نے یہاں موضع منڈی) دیونہ ضلع گجرات میں بزم طلوع اسلام قائم کرلی ہے۔ اور باہمی صلاح و مشورہ سے چوہدری محمد اکبر دوکاندار کو سکریٹری بزم طلوع اسلام چنا گیا ہے۔ اس علاقہ کے احباب کو چاہیئے کہ وہ بزم سے رابطہ قائم کریں۔

بزم چنیوٹ کریم بخش صاحب دوکاندار محلہ راجاں والہ ترجمان بزم طلوع اسلام چنیوٹ ضلع جھنگ تحریر فرماتے ہیں کہ ہم اہل چنیوٹ کے معاونین نے بزم کی تشکیل کرلی ہے۔ لہذا تحریک طلوع اسلام سے دلچسپی رکھنے والے حضرات محلہ راجاں والہ سے رجوع فرمائیں۔

بزم چک $\frac{216}{E.B.}$ ولایت اللہ صاحب مجنون سکریٹری بزم طلوع اسلام چک $\frac{216}{E.B.}$ ڈاک خانہ خاص براستہ دہاڑی ضلع ملتان تحریر فرماتے ہیں کہ

چند مخلصین نے یہاں بزم طلوع اسلام قائم کی ہے اور لائبریری بھی قائم کردی گئی ہے۔ لہذا علاقہ دہاڑی میں طلوع اسلام تحریک سے دلچسپی رکھنے والے حضرات مندرجہ پتہ پر رجوع فرمائیں۔

بزم ضلع سکھر محبوب علی شاہ بخاری سکریٹری بزم طلوع اسلام و مالک سردار انجینئرنگ ورکس بالمقابل ڈیمبلا فلور ملز کیمنہ روڈ سکھر تحریر فرماتے ہیں کہ

غریب خانہ پر سکھر اور روہڑی کے چند ہم خیال حضرات کی میٹنگ ہوئی۔ جس میں بزم طلوع اسلام ضلع سکھر قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا اور بندہ کو ترجمان یا سکریٹری منتخب کیا گیا۔ اپنے نظریہ کی تبلیغ کے لئے ایک لائبریری کے قیام اور لٹریچر کی اشاعت کا سوال بھی زیر بحث آیا۔ ضلع سکھر کے وہ حضرات جو ہمارے نظریہ سے متفق یا اس طرف مائل یا اسے سمجھنے کے مشتاق ہوں۔ براہ کرم ہماری بزم کی طرف رجوع فرمائیں۔ بندہ سوموار سے جمعرات تک کسی دن بھی صبح دس بجے سے بارہ بجے تک اور شام کو چھ بجے سے آٹھ بجے تک مل سکتا ہے۔

اسلامی تعلیمات اور دورِ حاضر کے علومِ جدیدہ

(از فاضل ازہر مولانا عبدالمنعم النمر۔ رکن بعثۃ ازہر و مقرر اسلامی برائے دارالعلوم دیوبند)

[طلوع اسلام بابت ستمبر ۱۹۵۶ء میں "علماء کون ہیں؟" کے عنوان سے ایک حقیقت افروز مقالہ شائع ہو چکا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ قرآن کی رو سے علماء وہ لوگ ہیں جو علوم سائنس کے ماہر ہیں۔ ذیل میں ہم اسی ضمن میں ایک مصری عالم کے افکار درج کرتے ہیں جو اسی حقیقت کی طرف راہ نمائی کرتے ہیں۔ یہ مقالہ اخبار مدینہ کے شکریہ کے ساتھ درج کیا جاتا ہے۔ طلوع اسلام]

وہ کون سے علوم ہیں جن کا حاصل کرنا مسلمان طالب علم کے لئے ضروری ہے؟ اس سوال پر اکثر بحث ہوا کرتی ہے۔ آج بھی ہم اس بحث میں حصہ لے رہے ہیں۔ بحث کا بنیادی نقطہ یہ ہوتا ہے کہ کچھ علوم کو یہ حیثیت دی جاتی ہے کہ وہ آخرت میں کارآمد ہوں گے اور قیامت کے روز اُن کے بارے میں ہم سے باز پرس ہوگی۔ مثلاً تفسیر، حدیث، فقہ، یہ علوم ہمارے لئے آخرت میں کارآمد ہیں ان کا سیکھنا ہم پر فرض ہے۔ ان میں کوتاہی ہوگی تو یوم الحساب میں ہم سے باز پرس ہوگی۔ ان کے ماسوا دوسرے علوم جن کو علوم آلیہ یا بنیادی علوم کہا جاتا ہے۔ وہ آخرت کے بارے میں کارآمد نہیں لہٰذا اخروی کامیابی کے پیش نظر ان کا سیکھنا بھی ضروری نہیں اور اُن کے حاصل کرنے میں عمر عزیز کا صرف کرنا بیکار ہے۔ جغرافیہ، حساب، سائنس وغیرہ اسی قسم کے علوم بتلائے جاتے ہیں۔

اس نظریہ کا پس منظر ایک حد تک قابل قدر ہے۔ ان بزرگوں کی خوش اعتقادی میں بھی کلام نہیں۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ اس طریقہ سے وہ دین کی خدمت کر رہے ہیں اور دینی تعلیمات کے بموجب ایک رائے قائم کر رہے ہیں۔ ان کے حسن نیت پر بحث نہیں ہے۔ لیکن مجبوری یہ ہے کہ انسان کے اعمال و افکار اور اس کی جد و جہد کو صحیح اور کارآمد بنانے کے لئے فقط حسن نیت کافی نہیں بلکہ حسن نیت کے ساتھ حسن بصیرت اور فکر صحیح بھی ضروری ہے۔ تاکہ قول و عمل سے وہ نتیجہ مرتب ہو سکے جو مفاد ملت کے لئے مطلوب ہے اور بقول شخصے

"نیکی برباد گناہ لازم" نہ آئے۔

غور و فکر کا نہج یہ ہونا چاہیئے کہ اسلام کے متعلق ہمارا یہ عقیدہ ہے اور یہی حقیقت ہے کہ وہ ایک زندہ مذہب اور ایسا پروگرام

ہے جو ملت کو دینی کامیابی کے ساتھ دنیاوی برتری اور سربلندی بھی عطا کرتا ہے۔ وہ قوم میں ایک کامل زندگی پیدا کرتا ہے۔ اسلام باقی تمام مذاہب سے اسی بنا پر ممتاز ہے کہ وہ انسان کے دنیوی مصالح کا بھی ایسا ہی لحاظ رکھتا ہے۔ جیسا کہ اس کی دینی ضروریات کا بلکہ دینی فرائض کی وہ ایک ایسی نوعیت قائم کرتا ہے کہ وہ دنیوی مصالح کے لئے تقویت و ترقی کا باعث بن سکیں وہ تمام صورتیں اور وہ تمام افکار جن سے بہتر معیشت اور اُخروی مفاد میں تصادم واقع ہو۔ یا مذہب اور مذہبی طبقہ کی سربلندی، اس کی شوکت و حشمت اور اس کی عزت اور وقار میں فرق آئے۔ ایسے تمام افکار اور نظریات مذہب کا نام لینے والے کوتاہ اندیش لوگوں کی کوتاہی نظر کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ ان کی نیتیں صحیح ہو سکتی ہیں۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ بصیرت اور تفقہ بھی صحیح ہو۔ اسی بناء پر کہا جاتا ہے کہ "آفۃ الادیان من جھل الدعاۃ" ہم بلاشک و شبہ پورے وثوق اور یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو ہر ایسے علم کی تائید کرتا ہے جو دنیاوی ترقیات کے لئے ناگزیر ہوں بلکہ آگے بڑھ کر یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ دنیاوی علوم کا سیکھنا مسلمانوں پر فرض کفایہ ہے۔ پس ایسے تمام علوم جو مسلمانوں کو صنعت، زراعت اور ایسے طریقے سکھائیں۔ جن سے وہ زمین کے خزانے برآمد کر سکیں، پٹرول اور دوسرے عناصر تلاش کر سکیں، مسلمانوں میں جنگی قوت اور مقاومت کی طاقت پیدا کر سکیں۔ یا ان کی دولت میں اضافہ کر سکیں۔ ایسے تمام علوم جو قوم کی معاشیات کے لئے معاون اور مفید ہوں۔ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ مسلمان ان کو بھی حاصل کریں۔ ان میں برتری اور مہارت پیدا کریں۔ تاکہ ملت اسلامیہ زندگی کے ہر گوشہ میں تنومند اور طاقتور ہو اور کسی بھی لحاظ سے غیر کی دست نگر اور محتاج نہ رہے۔ کیونکہ دست نگری اقتدار اعلیٰ کی زمام دوسروں کے سپرد کر دیتی ہے اور الاسلام یعلو ولا یعلیٰ علیہ کے برخلاف پیشانی ملت کو دوسروں کے سامنے سرنگوں کر دیتی ہے۔ ہمارے نزدیک اس تفریق کے لئے کوئی وجہ جواز نہیں کہ ہم کچھ علوم کو آخرت کے واسطے نافع مانیں اور کچھ کے متعلق یہ خیال رکھیں کہ آخرت میں ان کے بارے میں کوئی بازپرس نہ ہوگی۔

ہم ایک اور عقیدہ بھی پیش کرنا چاہتے ہیں۔ ممکن ہے وہ تعجب خیز ہو۔ مگر ہم اس کے صحیح تسلیم کرنے پر مجبور ہیں۔ اس تعجب انگیز عقیدہ کی تفسیر یہ ہے کہ جو چیزیں دنیا کی بہتر معیشت کے لئے مضر ہیں وہ یقیناً حیات اُخروی کے لئے بھی نقصان رساں ہیں۔ اس کی دلیل واضح ہے کیونکہ جو چیز دنیوی زندگی میں امت اسلامیہ کے لئے نقصان رساں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو حرام قرار دیا ہے وہ علم ہو یا عمل ہو۔ اس کے ارتکاب پر خدا کے ہاں بازپرس ہوگی۔ اس لئے کہ اوامر و نواہی کا مقصد یہ ہے کہ ایک صالح زندگی پیدا ہو اور انسان دنیا میں امن و امان کے ساتھ بھائی بھائی بن کر خوشگوار زندگی گذار سکیں۔ پس جب یہ صورت حال جس کو ہم دنیوی سعادت کہہ سکتے ہیں پیدا ہوگی تو لامحالہ اُخروی سعادت اور کامیابی بھی میسر آئے گی اور جب بھی اس دنیاوی سعادت میں خلل واقع ہوگا اُخروی کامیابی میں بھی فرق آ جائے گا۔ انتہا یہ کہ صرف معاملات نہیں بلکہ نماز اور روزہ جیسے امور جو محض عبادت ہیں ان کا منشا بھی سب سے پہلے نفس انسانی کی تہذیب، اخلاق کی اصلاح اور دنیوی معیشت میں فلاح و بہبود پیدا کرنا ہے۔

جب ان عبادتوں سے یہ مقاصد نہ پیدا ہوں یعنی اخلاق کی اصلاح نہ ہو، اجتماعی زندگی درست نہ ہو۔ نوع انسان کی ہمدردی اور آپس میں تعاون کی روح پیدا نہ ہو تو یہ عبادتیں اخروی کامیابی کے لئے بھی نفع بخش نہیں۔ چنانچہ کتاب اللہ کی شہادت موجود ہے۔ مثلاً نماز کے متعلق ارشاد ہے ان الصلوٰۃ تنھیٰ عن الفحشاء والمنکر یہ فحشا اور منکر جن کو نماز روکتی ہے۔ لامحالہ دنیوی معاملات ہی کے اندر ظہور پذیر ہوں گے۔ اور اسی کے متعلق آیہ کریمہ کی تصریح ہے۔ اگر نماز ان کا سدباب نہیں کر سکتی اور انسان نماز پڑھنے کے باوجود ایسی چیزوں میں مبتلا رہتا ہے جو اس کی اخلاقی اور جماعتی زندگی کے لئے نقصان رساں ہوں۔ جن سے دنیوی معیشت خراب ہو تو یہ نماز وہ نماز نہیں ہے جو شریعت کا مقصود ہے۔ یہ نماز جب اپنی تاثیر سے محروم ہے تو حقیقی روح سے بھی ہم کنار نہیں ہے۔ چنانچہ رسول کریم صلعم ارشاد فرماتے ہیں کہ جو نماز فحشا و منکر سے نہ روکے وہ اللہ تعالےٰ سے قریب کے بجائے بُعد پیدا کرے گی۔ اسی طرح روزہ دار کے متعلق ارشاد ہے کہ اگر وہ روزہ رکھ کر بھی مکر و فریب اور دھوکہ بازی کے کام نہیں چھوڑتا۔ تو خدا کو اس کی بھی ضرورت نہیں ہے کہ وہ دن بھر بھوکا پیاسا رہے۔ نبی کریم صلعم کا یہ ارشاد بھی اہل علم کو معلوم ہے کہ آپ نے ایک عبادت گذار عورت کے لئے جو پڑوسیوں کے حق میں بدخلق تھی فرمایا کہ وہ دوزخ میں جائے گی۔ غرض اس قسم کی بہت سی مثالیں واحادیث صاف اعلان کر رہی ہیں کہ عبادتوں کا مفاد اور ان کا نتیجہ اگر دنیاوی معاشرت کی اصلاح نہیں ہے تو اُن سے اُخروی مفاد بھی خاطر خواہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ بہرحال جب انسانی معاشرت کی اصلاح۔ اہل ملت کی برتری اور سربلندی اسلامی تعلیمات اور اس کے احکام وعبادات کا اہم ترین مقصد ہے تو کیا ہمارے لئے جائز ہو سکتا ہے کہ ہم دینی اور دنیوی علوم میں فرق پیدا کریں اور یہ کہہ سکیں کہ جن علوم سے دنیا میں ہماری برتری اور جماعتی زندگی کی سربلندی ہوتی ہے وہ فرض نہیں اور ان کے متعلق خدا کے ہاں باز پرس نہیں ہو سکتی۔ کیا اسلام اس کی اجازت دیتا ہے کہ ہم دنیا اور اس کے تقاضوں سے آنکھیں بند کر لیں۔ کیا اسلام کی تعلیم کسی بھی نوع سے رہبانیت کو برداشت کر سکتی ہے؟ اللہ تعالےٰ کا اس امت کے متعلق ارشاد ہے خَیْرَ اُمَّۃٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (بہترین امت جو لوگوں کے لئے وجود میں لائی گئی) اللہ تعالےٰ نے اعلان فرمایا ہے کہ عزت، اللہ اس کے رسول اور مسلمانوں کے لئے ہے۔ یہ آیتیں ہمارے سامنے ہیں اور ہم صبح وشام ان کو پڑھتے ہیں۔ پھر کیا کوئی ذی ہوش اور صاحب عقل یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ ایک ایسی امت اور ایک ایسی جماعت جو خیر امت ہو اپنے معاشی تقاضوں سے ناواقف اور ضروریات معیشت سے نابلد اور اُن علوم وفنون سے بے بہرہ ہو جن کو حاصل کر کے دوسری امتیں ترقی کی منزلیں طے کر رہی ہیں۔ اور نہ صرف ترقی کی منزلیں بلکہ وہ چیزیں پیدا کر رہی ہیں جو انسانیت کے لئے کارآمد اور نفع بخش ہیں۔ اور اس طرح اپنی برتری کا پرچم پورے عالم میں لہرا رہی ہیں۔

کیا آج دنیا میں وہ امت عزت پا سکتی ہے جو انجینئرنگ، طب، زراعت وصنعت، طبقات الارض، ہوائی اور بحری صنعتوں اور ان تمام چیزوں سے بے بہرہ ہو جو دور حاضر میں قومی زندگی اور قومی عزت واستحکام کے لئے سنگ بنیاد کا درجہ رکھتی ہیں؟ کیا یہ قوم جو اپنی تمام ضروریات میں دوسروں کی محتاج ہو۔ عزت کے کسی زینہ پر اپنا قدم رکھ سکتی ہے؟

ایک تلخ حقیقت کبھی نظر انداز نہیں ہونی چاہیئے۔ آج ہماری یہ عظیم الشان تعداد جو کروڑوں سے متجاوز ہے۔ اس طرح بے دست و پا افتادہ اور پسماندہ کیوں ہے؟ کیا اس بنا پر کہ ان علوم عصریہ اور فنون جدیدہ میں وہ مہارت حاصل کئے ہوئے ہے یا اس بنا پر کہ جس طرح وہ دین صحیح اور اخلاق کریمہ سے محروم ہے۔ ان فنون کی واقفیت سے بھی محروم ہے۔

بلاشبہ مسلمانوں کا اخلاقی تنزل قرن اولیٰ کے بعد ہی شروع ہو گیا تھا۔ مگر پھر بھی مسلمان عروج و ترقی سے ہم کنار رہے۔ اور مشرق و مغرب کے ممالک میں اپنے عروج اور شوکت و سطوت کے قطب مینار اس وقت تک تعمیر کرتے رہے۔ جب تک اپنے زمانہ کے دنیاوی علوم و فنون میں وہ دوسری تمام قوموں سے پیش پیش رہے اور جب سے ان فنون کی مہارت دوسروں کے حصہ میں آئی عروج و ترقی نے بھی مسلمانوں کا ساتھ چھوڑ کر انہی کی آغوش گرم کی جن کے پاس علوم عصریہ اور فنون جدیدہ کی دولت ترقی پذیر تھی۔ تاریخ ہمیں ایک نہایت دردناک اور تکلیف دہ حقیقت یاد دلا رہی ہے۔ کچھ مسلمان حکومتوں نے ملک کی ترقی کا منصوبہ بنایا۔ لیکن اس ترقی کی ضروریات فراہم کرنے سے وہ حکومتیں قاصر رہیں تو اغیار سے امداد حاصل کی۔ اس کا نتیجہ کیا برآمد ہوا؟ غلامی اور ذلت و خواری! ایسی ہی صورتیں دوسری اسلامی مملکتوں میں بھی پیش آئیں۔ پس کیا ہمارے لئے درست ہے کہ تاریخ کی ان تلخ حقیقتوں کو ہم فراموش کر دیں اور اس بات کا یقین نہ رکھیں کہ ملت کی تنومندی اور کامیابی صرف اسی صورت میں ہے جب ہر لحاظ سے وہ خود متکفل اور دوسروں سے بے نیاز ہو۔

اللہ تعالیٰ کا حکم ہے: اعدوا لھم ما استطعتم الآیۃ۔ اس کی تعمیل کس طرح ہو سکتی ہے۔ کیا اس آیت کا یہ تقاضہ نہیں ہے کہ مسلمان نہ صرف یہ کہ آلات حرب فراہم کریں بلکہ وہ تمام استعداد و صلاحیت اور مہارت پیدا کریں۔ جس سے وہ ہوائی جہاز، ٹینک، پیراشوٹ، تارپیڈو، بم، ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم سب کچھ تیار کر سکیں۔ تاکہ وہ دوسروں کے مقابلہ میں ایک قوی قوت ہوں، اور اس سیاسی دنیا میں ایک محاذ کی حیثیت سے قائم رہ سکیں۔

کیا اس آیت کی روشنی میں ان تمام علوم جدیدہ اور فنون عصریہ کا حاصل کرنا مسلمان پر فرض نہیں ہوگا؟ اور کیا اس فریضہ سے غفلت برت کر جس ذلت و خواری میں آج مسلمان پڑے ہوئے ہیں وہ عند اللہ بری الذمہ ہوں گے؟ اور بارگاہِ خداوندی میں جواب دہی نہیں کرنی ہوگی؟

یہ ایک فرض کی ایجابی شکل ہے۔ ترغیب کے سلسلہ میں رسول کریم صلعم کا وہ ارشاد یاد کیجئے۔ فرمایا۔ اللہ تعالیٰ ایک تیر پر تین کو جنت میں داخل کرتا ہے (۱) بنانے والے کو (۲) مجاہد تک پہنچانے والے کو (۳) پھینکنے والے کو۔ کیا اس کا منشا یہ نہیں ہے کہ قومی زندگی کے واسطے جس طرح اخلاقِ عالیہ کی ضرورت ہے ایسے ہی قوت کی بھی ضرورت ہے اور ذرائع قوت کی بھی۔ اور یہ سب ثواب کے کام ہیں۔

بیشک کسی کو نقصان پہنچانے کے لئے قوت کا استعمال انسانیت پر، انسانی اخلاق پر، دنیا کے امن و امان پر بدترین ظلم ہے۔ لیکن اپنے تحفظ و بقا کے لئے، اپنی خودداری اور باوقار زندگی کے واسطے قوت کا تحفظ اہم ترین ملی، قومی اور اخلاقی

فرض ہے

بلاشبہ جنگی آلات کی صنعت ایک جہاد ہے۔ اسی طرح ہر وہ صنعت جو قومی زندگی کے بقاء و تحفظ کے لئے ضروری ہو اس کا اختیار کرنا بھی یقیناً جہاد ہے۔ کاشتکار ملک اور قوم کے لئے غلہ پیدا کر کے جہاد کر رہا ہے۔ ڈاکٹر ڈاکٹری سیکھ کر سرجری کا علم حاصل کر کے قوم کے لئے جہاد کر رہا ہے۔ طبقات الارض کی تعلیم حاصل کرنا اور اس علم کو کام میں لانا قومی جہاد ہے اسی طرح ملک و ملت کے جس تقاضہ کو بھی جو جماعت انجام دے رہی ہے۔ وہ ایک جہاد کر رہی ہے۔

پس اسلام کا فیصلہ یہ ہے کہ اس کے پیرو، اس کے ماننے والے اور احترام کرنے والے ہر علم و فن میں بہترین مہارت کے مالک ہوں۔ اسلام کا مطالبہ یہ ہے کہ اس کے ماننے والے زندگی کے ہر شعبہ میں پیش پیش ہوں۔ وہ تمام دنیا کو علم و عمل کے خزانے تقسیم کریں۔ تہذیب و اخلاق کے معلم بن کر دنیا کو ایک بہتر اور بلند تر معیشت سے پُر رونق بنائیں۔ تاکہ وہ بین الاقوامی قیادت کے مالک ہوں اور اس فرض کو انجام دے سکیں جو ارشادِ خداوندی کنتم خیر امۃ اخرجت للناس کے بموجب ان کے ذمہ عائد ہوتا ہے۔

حضرات علماء کرام، فقہاء ملت۔ مدبرین اور مفکرین رہنما غور فرمائیں کہ کیا ان کوتاہیوں پر اللہ تعالےٰ کے ہاں باز پرس نہ ہوگی اور جب کہ یہ دنیاوی علوم بھی مقاصد کے لحاظ سے ضروری ثابت ہوں تو کیا عنداللہ یہ بھی نافع اور ان سے ناواقفی موجب گرفت اور باعث مواخذہ نہ ہوگی؟ پس اس تفریق بے معنی کا مدار غرض اور نیت پر رہا۔ اگر خاص دینی علوم بھی دنیا طلبی کے لئے پڑھے جائیں تو حرام ہیں۔ اسی طرح دنیاوی علوم اگر دینی مقاصد کے لئے ہوں تو وہ موجب اجر و ثواب ہیں۔ واللہ اعلم۔ واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

اسباب زوال امت

دوسرا ایڈیشن

از پرویز

مسلمانوں کی ہزار سالہ تاریخ میں پہلی مرتبہ بتایا گیا ہے کہ ہمارا مرض کیا ہے اور علاج کیا؟

صفحات ۱۷۶۔ قیمت: دو روپے

ناظم ادارہ طلوع اسلام کراچی

DURA-GLOSS
Nail Polish
MADE IN U.S.A.
ڈوراجلوس
ناخون کی پالش
تزئین حسن کے لئے
ناخون کی آرائش ضروری ہے
ڈوراجلوس
خوش رنگ۔ دیدہ زیب۔ چمکدار اور
خوشبودار پالش ہے۔
امریکہ میں تیار شدہ
ہر بڑے دوکاندار سے ملتی ہے

سلسلۂ اصلاح وتذکیر (محترم عمر احمد صاحب عثمانی)

قرآنی معاشرہ

باہمی تعلقات کے متعلق قرآن کی تعلیم

(۷)

[اس مضمون کی گذشتہ پانچ اقساط میں یہ بتایا گیا تھا کہ اولاد کو اپنے والدین کے ساتھ اور والدین کو اپنی اولاد کے ساتھ نیز بھائی بہنوں کو آپس میں کس طرح پیش آنا چاہیئے۔ اور اس سلسلہ میں ہر ایک کے فرائض و واجبات کیا ہیں؟ اس کے بعد چھٹی قسط میں یہ بتایا گیا کہ میاں بیوی کے تعلقات کی کیا نوعیت ہے؟ اور ان کے ایک دوسرے پر کیا حقوق و واجبات ہیں۔ ہذا ان کو آپس میں کس طرح رہنا چاہیئے۔ یہ عنوان ہنوز جاری ہے۔ طلوع اسلام]

میاں بیوی

مہر نکاح ایک معاہدہ ہے اور اس معاہدہ کے وقت مرد کو کچھ مقررہ رقم بیوی کو ادا کرنی چاہیئے جو بطور تحفہ کے اسے دی جاتی ہے جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے عورت اور مرد کے میدان ہائے عمل الگ الگ ہیں۔ مرد کو قرآن نے فرد کا سب قرار دیا ہے، اور عورت اور بچوں کے تمام اخراجات اسی پر ڈالے گئے ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ عورتوں کو کچھ کمانے کی اجازت ہی نہیں ہے مطلب یہ ہے کہ عام حالات میں عورت کی جو ذمہ داریاں ہوتی ہیں ان کے ساتھ اسے اتنا وقت نہیں بلتا کہ وہ اپنی یا اپنے بچوں کی ضروریات کے لئے کچھ پیدا کر سکے۔ بدیں حالات زیادہ تر ایسی صورتیں پیش آئیں گی کہ عورتیں روپیہ پیسہ کے معاملہ میں مردوں کی دست نگر اور محتاج ہوں عام حالات میں وہ خود کما نہیں سکتیں، انھیں ایک ایک پیسہ کے لئے مردوں کا منہ تکنا پڑے گا۔ ہو سکتا ہے کہ عورت کسی موقعہ پر کچھ خرچ کرنا چاہے لیکن مرد اس کو کوئی اہمیت نہ دے۔ کچھ عرصہ گذر جانے کے بعد جب میاں بیوی ایک دوسرے کے مزاج کو اچھی طرح سمجھ جائیں اور ایک دوسرے سے بے تکلف ہو جائیں تو پھر اس قسم کی دشواریاں بہت کم پیش آتی ہیں۔ لیکن شادی کے بعد ابتدائی دور میں لڑکی کو اس قسم کی دشواریاں قدم قدم پر پیش آسکتی ہیں۔ نیز ہو سکتا ہے کہ شادی کے بعد یہ محسوس ہو کہ میاں بیوی ایک دوسرے کے ساتھ گذارہ نہیں

کرسکیں گے اور نوبت طلاق تک پہنچ جائے۔ عدت گذارنے کے بعد ضروری نہیں کہ اس عورت کو فوراً ہی کوئی دوسرا مناسب شوہر مل جائے۔ اس عرصہ میں بھی اس کو دشواریاں پیش آسکتی ہیں۔ چونکہ عورت فرد کا سب نہیں ہے اسلئے اسکے حال اور مستقبل کو ممکنہ حد تک محفوظ کردینا نہایت ہی ضروری تھا۔ اس لئے قرآن نے مرد کے ذمہ یہ لازم قرار دیا ہے کہ وہ باہمی معاہدہ کے مطابق جس قدر مال طے پاجائے بطور تحفہ کے بیوی کو ادا کردے جو اسی کی ملکیت ہوگا اور وہ جس طرح چاہے اسے صرف کرسکتی ہے۔ قرآن کریم میں محرمات نکاح کا بیان کرنے کے بعد آیا ہے۔

وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ ۚ فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً (۴/۲۴)

مذکورہ بالا عورتوں کے علاوہ باقی عورتیں تمہارے لئے حلال ہیں۔ یعنی اپنے مال ادا کرکے تم ان کو عفت وعصمت کی حفاظت کے لئے طلب کرو نہ کہ محض شہوت رانی کے لئے۔ اسکے بعد جن عورتوں سے متمتع ہوتے ہو انھیں ان کے مہر جو تم پر واجب تھے ادا کردیا کرو۔

مہر میں کمی بیشی

ہوسکتا ہے کہ نکاح کے وقت گرانقدر مہر باندھ لیا گیا ہو۔ اور اس کے بعد بیوی اپنے شوہر کی طبیعت کا اندازہ کرکے اس کی ضرورت نہ سمجھے کہ وہ اپنی ملکیت میں اس قدر کثیر رقم رکھے۔ نیز یہ بھی ہوسکتا ہے کہ نکاح کے وقت مہر کم باندھا گیا ہو اور بعد میں ضرورت محسوس ہو کہ اس میں اضافہ کیا جائے۔ بہرحال باہمی رضامندی سے مہر کی مقدار میں کمی بیشی کی جاسکتی ہے۔ یعنی مہر کو فریضہ کہنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ باہمی رضامندی سے اس میں بعد میں کوئی تبدیلی نہیں کی جاسکتی۔ ضرورت کے مطابق تبدیلی کی جاسکتی ہے۔

وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا تَرٰضَيْتُمْ بِهٖ مِنْۢ بَعْدِ الْفَرِيْضَةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۝ (۴/۲۴)

اس میں کوئی حرج نہیں کہ ہر ایک مرتبہ مقرر کرلینے کے بعد تم اس میں باہمی رضامندی سے کچھ (تبدیلی) کرنا چاہو۔ یقیناً خدا جاننے والا اور حکمت والا ہے۔

اس سے یہ چیز واضح ہوجاتی ہے کہ یہ کوئی سودے بازی کا معاملہ نہیں کہ مرد عورت کو کسی چیز کا معاوضہ ادا کرتا ہو۔ معاوضہ اور قیمت تو وہی ہوتی ہے جو معاملہ کے وقت طے پاجاتی ہے۔ مگر یہاں حالات اور ضروریات کے پیش نظر بعد میں کمی بیشی اور تبدیلی بھی کی جاسکتی ہے

مہر معاوضہ نہیں

اس لئے مہر کو استمتاع کا معاوضہ سمجھنا غلط ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں بعض فقہاء نے مہر کو استمتاع کا معاوضہ ہی قرار دیا ہے مگر قرآن کریم نے دوسری جگہ اس کو بالکل صاف کردیا ہے۔ جہاں تبدیلی ہے کہ یہ محض ایک تحفہ ہوتا ہے۔ سورۂ نساء کی آیت ہے۔

وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً ۭ فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا

فَكُلُوهُ هَنِيئًا مَّرِيئًا (۴/۴)

اور عورتوں کو ان کے مہر بطور تحفہ اور عطیہ کے دے دیا کرو۔ پھر اگر وہ اپنے دل کی رضامندی سے اس میں سے کچھ تمہیں واپس کر دیں تو تم اسے خوشگوار چیز کی طرح کھا سکتے ہو۔

یعنی یہ مہر اس طرح ادا کرنے چاہئیں جس طرح شہد کی مکھیاں بلا کسی معاوضہ کے تمہیں شہد مہیا کرتی ہیں (نِحْلَةً، نَحْلٌ ہی سے مشتق ہے جسکے معنی شہد کی مکھی کے ہیں اسی سے نُحْلٌ آتا ہے جس کے معنی عطیہ ہی کے ہوتے ہیں) لہٰذا مہر قرآن کی رو سے معاوضہ نہیں بلکہ تحفہ اور عطیہ ہے۔

مہر کی مقدار قرآن کریم نے مہر کی کوئی مقدار مقرر نہیں کی۔ یہ کم سے کم بھی ہو سکتا ہے اور زیادہ سے زیادہ بھی لیکن ہر حال اتنا ضرور ہونا چاہئے کہ اسے مال کہا جا سکے۔ کیونکہ قرآن نے بِاَمْوَالِكُمْ کے لفظ سے یہ بتا دیا ہے کہ وہ کم از کم مال ہونا چاہئے۔ زیادہ کی کوئی مقدار مقرر نہیں ہے۔ وہ سونے کا ایک ڈھیر بھی ہو سکتا ہے۔

وَاِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ وَّاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْـًٔا (۴/۲۰)

اگر تم ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی تبدیل کرنا چاہو تو اگر تم نے ایک بیوی کو مہر میں سونے کا ایک ڈھیر بھی دیدیا تھا تو اس میں سے بھی کچھ واپس نہ لو۔

لہٰذا مہر میں سونے کا ایک ڈھیر بھی دیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ مہر گراں سے گراں تر باندھے جائیں اتنے گراں کہ انھیں شوہر ادا ہی نہ کر سکے۔ جیسا کہ ہمارے ہاں عام طور پر ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں عموماً یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ محض ایک رسمی چیز ہے جس کو ادا کرنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لہٰذا دس بیس ہزار اور لاکھ دو لاکھ جتنا جی چاہے باندھ دیا جائے۔ اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ یہ خیال قطعاً غلط ہے۔ مہر کی جو مقدار مقرر کر کے باندھی جائے وہ اس نیت سے باندھی جائے کہ اس کو بالضرور ادا کرنا ہوگا۔ اور یہ دیکھ لینا چاہیئے کہ جتنی مقدار کا مہر باندھا جا رہا ہے شوہر کی حیثیت اسکی متحمل بھی ہے یا نہیں۔ مہر نکاح کے بعد رخصتی کے وقت ادا کر دینا چاہیئے۔ البتہ اگر بیوی کی رضامندی سے اسکی ادائیگی کو مؤخر کر دیا جائے تب بھی جائز ہے۔ لیکن بہرحال اگر خدانخواستہ جدائی کی نوبت آجائے تو اس وقت تو اس کو ادا کرنا ہی ہوگا۔

ہر عورت سے نکاح جائز نہیں ہر عورت سے نکاح نہیں کیا جا سکتا۔ بعض عورتیں ایسی بھی ہیں جن سے نکاح کرنا جائز نہیں چنانچہ سورۂ نساء میں ان کی پوری تفصیل دیدی گئی ہے۔

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ وَبَنٰتُكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ وَعَمّٰتُكُمْ وَخٰلٰتُكُمْ وَبَنٰتُ الْاَخِ وَبَنٰتُ الْاُخْتِ وَاُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِيْٓ اَرْضَعْنَكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ وَاُمَّهٰتُ نِسَآئِكُمْ وَرَبَآئِبُكُمُ الّٰتِيْ فِيْ حُجُوْرِكُمْ مِّنْ نِّسَآئِكُمُ الّٰتِيْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَاِنْ لَّمْ تَكُوْنُوْا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ

عَلَيْكُمْ وَحَلَائِلُ أَبْنَائِكُمُ الَّذِينَ مِنْ أَصْلَابِكُمْ وَأَنْ تَجْمَعُوا بَيْنَ الْأُخْتَيْنِ إِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ۗ إِنَّ اللَّهَ كَانَ غَفُورًا رَحِيمًا ۝ وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ النِّسَاءِ إِلَّا مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ ۚ كِتَابَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ ۚ وَأُحِلَّ لَكُمْ مَا وَرَاءَ ذَٰلِكُمْ (۴/۲۳-۲۴)

تم پر حرام قرار دی گئی ہیں تمہاری مائیں۔ بیٹیاں، بہنیں، پھوپھیاں، خالائیں، بھتیجیاں، بھانجیاں۔ دودھ پلانے والی مائیں۔ دودھ شریک بہنیں اور ساسیں، اور وہ لڑکیاں جو تمہاری ان بیویوں سے ہوں جن کو تم ہاتھ لگا چکے ہو اور جو تمہارے دامن تربیت میں ہیں۔ البتہ اگر ایسی بیوی کی لڑکی ہو جسے تم نے ہاتھ نہیں لگایا تو کوئی حرج نہیں ہے نیز تمہارے ان بیٹوں کی بیویاں جو تمہاری صلب سے ہوں۔ الا یہ کہ تم بیک وقت دو بہنوں کو جمع کرو۔ بجز اسکے جو اس سے پہلے ہو چکا ہو۔ یقیناً خدا سا مان حفاظت دینے والا اور مہربان ہے۔ ایسے ہی وہ عورتیں بھی حرام قرار دی گئی ہیں جو شادی شدہ ہوں۔ بجز ان عورتوں کے جن کے تمہارے ہاتھ مالک ہو چکے ہوں۔ یہ خدا کا قانون ہے جو تم پر نافذ کیا گیا ہے۔ اور ان مذکورہ عورتوں کے علاوہ باقی عورتیں تمہارے لئے حلال ہیں۔

ان کے علاوہ، ان عورتوں سے بھی نکاح نہیں کیا جا سکتا جن سے تمہارے والد نکاح کر چکے ہوں۔ اسی سورت میں ہے۔

وَلَا تَنْكِحُوا مَا نَكَحَ آبَاؤُكُمْ مِنَ النِّسَاءِ إِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ۗ إِنَّهُ كَانَ فَاحِشَةً وَمَقْتًا وَسَاءَ سَبِيلًا (۴/۲۲)

اور ان عورتوں سے نکاح نہ کرو جن سے تمہارے باپ نکاح کر چکے ہوں۔ جو اس سے پہلے ہو چکا ہے۔ وہ مستثنیٰ ہے۔ یقیناً یہ بات بڑی ہی بے حیائی اور برائی کی ہے۔ اور یہ بہت ہی برا راستہ ہے۔

ساتھ ہی ان عورتوں سے بھی نکاح نہیں کیا جا سکتا جو شرک کی آلودگی میں گرفتار ہوں۔

وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكَاتِ حَتَّىٰ يُؤْمِنَّ ۚ وَلَأَمَةٌ مُؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِنْ مُشْرِكَةٍ وَلَوْ أَعْجَبَتْكُمْ ۗ وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِينَ حَتَّىٰ يُؤْمِنُوا ۚ وَلَعَبْدٌ مُؤْمِنٌ خَيْرٌ مِنْ مُشْرِكٍ وَلَوْ أَعْجَبَكُمْ ۗ (۲/۲۲۱)

اور مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو تا آنکہ وہ ایمان لے آئیں۔ بلاشبہ ایک مومن باندی ایک مشرک عورت سے کہیں بہتر ہوتی ہے خواہ وہ تمہیں کتنی ہی بھلی معلوم ہوتی ہو۔ ایسے ہی (اپنی عورتوں کا) مشرک مردوں سے نکاح نہ کرو تا آنکہ وہ ایمان لے آئیں۔ ایک مومن بندہ ایک مشرک سے کہیں بہتر ہے۔ خواہ وہ تمہیں کتنا ہی اچھا معلوم ہوتا ہو۔

یہی مضمون سورۂ ممتحنہ میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا جَاءَكُمُ الْمُؤْمِنَاتُ مُهَاجِرَاتٍ فَامْتَحِنُوهُنَّ ۖ اللَّهُ أَعْلَمُ بِإِيمَانِهِنَّ ۚ فَإِنْ عَلِمْتُمُوهُنَّ مُؤْمِنَاتٍ فَلَا تَرْجِعُوهُنَّ إِلَى الْكُفَّارِ ۖ لَا هُنَّ حِلٌّ

لَهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّونَ لَهُنَّ ۖ وَآتُوهُم مَّا أَنفَقُوا ۚ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ أَن تَنكِحُوهُنَّ إِذَا آتَيْتُمُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ ۚ وَلَا تُمْسِكُوا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ وَاسْأَلُوا مَا أَنفَقْتُمْ وَلْيَسْأَلُوا مَا أَنفَقُوا ۚ ذَٰلِكُمْ حُكْمُ اللَّهِ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ ۚ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ۝ (۶۰/۱۰)

اے پیروان دعوت ایمانی! جب تمہارے پاس ہجرت کرکے مومن عورتیں آئیں تو ان کی آزمائش کرلیا کرو خدا کو ان کے ایمان کے متعلق خوب معلوم ہے۔ اگر تم انہیں مومن جانو تو انہیں کافروں کے پاس واپس نہ کرو۔ نہ وہ ان کے لئے حلال ہیں اور نہ ہی وہ مشرکین ان کے لئے حلال ہیں۔ جو کچھ انہوں نے (مہر میں) خرچ کیا ہو وہ ان کو دے دو۔ تم پر کوئی مضائقہ نہیں۔ اگر تم ان کے مہر ادا کرکے ان سے نکاح کرلو۔ اور کافر عورتوں کے ہاتھ نہ پکڑو۔ جو کچھ تم نے کافر عورتوں پر (مہر میں) خرچ کیا ہو وہ ان سے مانگ لو اور جو کچھ انہوں نے (مسلمان عورتوں کے مہر میں) خرچ کیا ہو وہ تم سے مانگ لیں۔ یہ اللہ کا فیصلہ ہے جو وہ تمہارے درمیان کرتا ہے اور اللہ سب کچھ جاننے والا اور خبردار ہے۔

البتہ مسلمان مردوں کے لئے اہل کتاب (یہودی اور نصرانی) عورتوں کے ساتھ نکاح کرلینا جائز ہے۔

اَلْيَوْمَ أُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبَاتُ ۖ وَطَعَامُ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ حِلٌّ لَّكُمْ وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ ۖ وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ الْمُؤْمِنَاتِ وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِن قَبْلِكُمْ إِذَا آتَيْتُمُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ مُحْصِنِينَ غَيْرَ مُسَافِحِينَ وَلَا مُتَّخِذِي أَخْدَانٍ ۖ (۵/۵)

آج تمہارے لئے سب دل پسند اور عمدہ چیزیں حلال کردی گئی ہیں۔ اور اہل کتاب کا کھانا تمہارے لئے حلال اور تمہارا کھانا ان کے لئے حلال کردیا گیا ہے۔ نیز پاکدامن مومن عورتیں ان لوگوں کی پاکدامن عورتیں جن کو تم سے پہلے کتاب دی گئی تھی حلال کردی گئی ہیں۔ جب کہ تم انہیں اُن کے مہر ادا کرکے ان سے نکاح کرو عصمت کی حفاظت کے لئے نہ کہ شہوت رانی کے لئے۔ یا در پردہ آشنائیاں کرنے کے لئے۔

مذکورہ بالا آیات سے یہ معلوم ہوگیا کہ کن کن عورتوں سے قرآن کی رُو سے نکاح نہیں کیا جاسکتا اور کن عورتوں سے نکاح کیا جاسکتا ہے جن عورتوں کے ساتھ ایک مسلمان مرد نکاح کرسکتا ہے اگر وہ مقررہ مہر ادا کرکے ان سے نکاح کرلے تو اب یہ دونوں معاہدہ نکاح کے پابند ہوجاتے ہیں۔ اس کے بعد مرد کے حقوق عورت کے ذمہ اور عورت کے حقوق مرد کے ذمہ واجب ہونا شروع ہوجائینگے

حقوق زوجین چونکہ مردوں اور عورتوں کے میدان بالکل الگ الگ ہیں۔ اس لئے ان حقوق و واجبات کی شکل کتنی ہی مختلف کیوں

نہ ہو لیکن ان کی نوعیت ایک سی ہی ہوتی ہے۔ عورت کے ذمہ مرد کے بھی ایسے ہی حقوق و واجبات ہوتے ہیں جیسے خود مرد کے ذمہ عورت کے حقوق و واجبات ہوتے ہیں۔ گھر میں شوہر اور بیوی کی حیثیت یکساں سی ہوتی ہے اور دونوں باہمی تعاون و تناصر سے ایک دوسرے کی تکمیل کرتے اور ایک دوسرے کی کوتاہیوں کو ڈھانپتے ہیں۔

هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ (۲/۱۸۷)

وہ تمہارے لئے لباس کا درجہ رکھتی ہیں اور تم ان کے لئے

لباس کا کام جہاں انسانی جسم کی زینت و آرائش میں اضافہ کرنا ہے وہیں ساتھ ہی جسم کے نقائص و عیوب کی پردہ پوشی کرنا بھی ہے۔ ایسے ہی گھر میں مرد عورت کے لئے وجہ زیبائش ہے تو عورت مرد کے لئے باعث آرائش ہے۔ عورت مرد کے نقائص کا ازالہ کرتی ہے تو مرد عورت کے نقائص کا ازالہ کرتا ہے۔ اور اس طرح اپنی اپنی مضمر صلاحیتوں کے کام لے کر اپنے چھوٹے سے گھر کو جنت بنا لیتے ہیں مناسب ہوگا کہ یہاں لفظ لباس کی کچھ تشریح کر دی جائے۔ تاکہ شوہر اور بیوی کے تعلقات کی تصویر سامنے آجائے۔

لِبَاسٌ ہر اس چیز کو کہتے ہیں جسے پہنا جائے۔ لَبِسَ امْرَأَتَهُ کے معنی ہوتے ہیں کہ اس نے اس عورت سے زمانہ دراز تک استفادہ اور استمتاع کیا لِبْسٌ اس باریک جھلی کو کہتے ہیں جو گوشت اور کھال کے درمیان ہوتی ہے۔ ابن عزہ کا قول ہے کہ لِبَاسٌ دراصل مُلَابَسَةٌ کا اسم مصدر ہے جسکے معنی اختلاط اور اجتماع کے آتے ہیں لَبِيسٌ شکل اور نظیر کو کہتے ہیں لَابَسَ فُلَانًا کے معنی ہوتے ہیں وہ اس کے اندر گھس گیا۔ اور اسکی اندرونی کیفیات تک کا اس نے پتہ لگا لیا۔

ان تصریحات سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ لباس کے مفہوم میں زمانہ دراز تک استمتاع اور استفادہ۔ اندرونی اتصال۔ اختلاط و اجتماع مثل و نظیر ہونا اور رازداری وغیرہ سب چیزیں شامل ہیں۔ ہذا هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ کے یہ معنی ہوئے کہ شوہر اور بیوی کا تعلق اس قسم کا ہوتا ہے کہ وہ ایک دوسرے سے زمانہ دراز تک فائدہ اٹھاتے اور استمتاع کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کے ساتھ ان کا تعلق محض ظاہر داریوں کا نہیں بلکہ اندرونی اتصال کا تعلق ہوتا ہے۔ وہ باہم مختلط اور مجتمع ہو کر زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان کی زندگی انفرادی نہیں ہوتی۔ وہ اجتماعی بلکہ اختلاطی ہوتی ہے۔ وہ ایک دوسرے کے مثل اور نظیر ہوتے ہیں۔ اور ایک دوسرے کے اندرونی رازوں تک سے واقف ہوتے ہیں۔ بہرحال یہ تعلق ہوتا ہے جو ایک میاں اور بیوی کے درمیان میں ہونا چاہیئے۔

معاشی ذمہ داری شوہر پر ہے

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے قرآن کی رو سے عورت فرد کاسب نہیں ہوتی۔ اس کی ذمہ داریاں چونکہ اس قسم کی ہوتی ہیں کہ ان کو پورا کرنے کے بعد اسکے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا کہ وہ معاشی ذمہ داریوں کو بھی کما حقہ پورا کر سکے۔ اسلئے قرآن کریم نے شوہر پر یہ ذمہ داری رکھی ہے کہ وہ گھر کے افراد (بیوی اور بچوں) کی معاشی ذمہ داریوں کو پورا کرے۔ وہ انکیں۔ کھانا۔ لباس۔ مکان۔ علاج تعلیم و تربیت وغیرہ مہیا کرے۔ اور اس کے لئے سرمایہ پیدا کرے۔ کیونکہ وہ ان ذمہ داریوں کو باحسن وجوہ پورا کر سکتا ہے۔

اَلرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَا

اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ۔ (۴/۳۴)

مرد عورتوں کی معاشی دیکھ بھال کرنے والے ہیں۔ کیونکہ خدا نے بعض کو بعض پر مختلف جہات سے برتری دی ہے (چنانچہ کچھ خصوصیات میں مرد برتر ہیں تو کچھ خصوصیات میں عورتیں برتر ہیں۔ معاشی ذمہ داریوں کو مرد زیادہ سہولت سے پورا کر سکتا ہے) لہٰذا مردوں کو اپنے اموال گھر والوں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے کھلے رکھنے چاہئیں۔

قَوَّامُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ کے معنی ہر طریق پر عورتوں کا متکفل اور ذمہ دار ہونے کے ہیں۔ چنانچہ تاج العروس (لغت کی ایک مشہور اور ضخیم کتاب) میں ہے قَامَ الرَّجُلُ الْمَرْأَۃَ اور قَامَ عَلَیْھَا کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ مرد نے عورت کی تمام ضروریات کو پورا کیا۔ اور اس کے معاملات کا متکفل ہوا۔ قَوَّامٌ عَلَیْھَا کے معنی ہوتے ہیں کہ وہ اس کی تمام ضروریات کو پورا کرنے والا ہے قَامَ عَلٰی اَھْلِهٖ کے معنی ہیں کہ اس نے اپنی بیوی کی تمام ضروریات کو پورا کر دیا (۴/۳۴) لہٰذا قَوَّامُوْنَ کے عموم میں عورتوں کی حفاظت وصیانت، ان کی معاشی ضروریات کی کفالت۔ ان کے راحت و آرام کی فکر، ساری چیزیں آجاتی ہیں۔ معاشی ضروریات میں کھانا، کپڑا، مکان، بیماریوں کا علاج معالجہ، غرضیکہ ساری ذمہ داریاں داخل ہیں۔ قَوَّامُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ کے معنی عورتوں کے حاکم نہیں۔ جیسا کہ ہمارے عام تراجم میں معنی کئے گئے ہیں۔ ان تراجم کے زیر اثر مسلمانوں میں عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ مرد عورتوں کے حاکم ہیں۔ خدا نے انہیں ان پر داروغہ مقرر کر دیا ہے۔ عورتیں ان کی محکوم ہیں وہ جس طرح چاہیں ان پر حکومت کر سکتے ہیں۔ حالانکہ قَوَّامُوْنَ کے یہ معنے خود زبان اور لغت کے خلاف ہیں عربی زبان میں قَامَ عَلٰی کے یہ معنی نہیں آتے۔

عورتیں اپنی کمائی کی مالک ہیں

بہرحال یہ تمام ذمہ داریاں مرد پر عائد ہوتی ہیں لیکن اس کے یہ معنے نہیں کہ عورتوں کو کچھ کمانے کی ممانعت ہے۔ اگر وہ کچھ پیدا کر سکتی ہیں اور اس مقصد کے لئے کچھ وقت نکال سکتی ہیں تو انہیں ایسا کرنا جائز ہے۔ اس طرح پر جو کچھ وہ پیدا کریں گی۔ وہ خود اسکی مالک ہونگی۔ انہیں مجبور نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اپنی محنت سے حاصل کی ہوئی دولت کو بھی اپنے شوہر کے حوالہ کر دیں۔

وحدتِ ازدواج

قرآن کی رو سے قانون یہی ہے کہ ایک وقت میں ایک مرد کی ایک ہی بیوی ہو (اس قانون میں استثناء کی صورت کو آگے چل کر بیان کیا گیا ہے) اگر اس کی بیوی اسکی مرضی کے مطابق نہیں۔ وہ اسے پسند نہیں کرتا۔ اور اسے کوئی امید نہیں کہ وہ اس کے ساتھ گذارہ کر سکیگا۔ یعنی اگر ایسی کوئی معقول وجہ موجود ہے جس کی بنا پر اسے کسی دوسری عورت سے نکاح کرنے کی ضرورت ہے۔ تو قرآن کریم ایسی صورت میں اس کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ اس بیوی کی موجودگی میں دوسری عورت سے شادی کرے البتہ وہ اس کی اجازت دیتا ہے کہ اس بیوی کو چھوڑ کر کسی دوسری عورت سے شادی کر لی جائے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ

وَاِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ ۙ وَّاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْـًٔا ۭ اَتَاْخُذُوْنَهٗ بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا ۔ (۴/۲۰)

اور اگر تم ایک بیوی کی جگہ (اسے چھوڑ کر) دوسری بیوی کرنا چاہو۔ اور تم ایک بیوی کو (دے نے کا) ایک ڈھیر (دھن) دے چکے ہو تو اس سے اس میں سے کچھ واپس نہ لو۔ کیا تم بہتان لگا کر اور واضح گناہ کا ارتکاب کر کے اسے لینا چاہتے ہو۔؟

(ایک بیوی کو کن حالات میں چھوڑا جا سکتا ہے اس کا ذکر طلاق کے عنوان میں آئے گا)

تعدد ازدواج

البتہ اگر ایسے ہنگامی حالات پیدا ہو جائیں جن میں بجز اس کے اور کوئی مناسب حل ہی نہ ہو کہ تعدد ازدواج کی اجازت دی جائے۔ مثلاً معاشرہ میں ایسی عورتوں کی تعداد بہت بڑھ جائے جو شادی کے قابل ہوں اور (طویل جنگوں کی وجہ سے) معاشرے میں اتنے مرد موجود نہ ہوں جو ان سے شادی کر سکیں۔ کیونکہ آپ اس سے پہلے بھی یہ دیکھ چکے ہیں کہ مسلمان عورتوں کے لئے قرآن نے کفار و مشرکین حتیٰ کہ اہل کتاب سے بھی شادی کرنے کو جائز قرار نہیں دیا۔ لہٰذا معاشرے میں جتنی عورتیں بھی ہونگی انہیں مسلمانوں کے معاشرے میں کھپانا ضروری ہے۔ اس کا حل اس کے سوا اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا کہ ایسی صورت میں تعدد ازدواج کی اجازت دی جائے۔ چنانچہ قرآن کریم میں ہے۔

وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی فَانْکِحُوْا مَا طَابَ لَکُمْ مِّنَ النِّسَآءِ
مَثْنٰی وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ج فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَۃً اَوْ مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ
ذٰلِکَ اَدْنٰٓی اَلَّا تَعُوْلُوْا (۴/۳)

اگر تمہیں یہ اندیشہ ہو کہ "یتامیٰ" کے بارے میں تم عدل و قسط کا سلوک نہیں کر سکو گے تو ان عورتوں میں سے جو تمہارے لئے حلال یا پسندیدہ ہوں ان سے دو دو، تین تین، چار چار کی تعداد میں شادیاں کر لو۔ پھر اگر تمہیں یہ اندیشہ ہو کہ ان بیویوں میں عدل نہیں کر سکو گے تو ایک ہی شادی کرو۔ یا ملک یمین پر اکتفا کرو۔ یہ صورت اسکے قریب تر ہے کہ تم کسی ایک طرف نہ جھک جاؤ۔

آیت مذکورہ بالا کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے "یتامیٰ" کا مفہوم سمجھ لیا جائے۔ "یَتِیْمٌ" کے بنیادی معنی تو اس شخص کے ہیں جو اپنے آپ کو معاشرہ میں تنہا محسوس کرے۔ لیکن استعمال میں ان بچوں کو یتیم کہا جاتا ہے جن کا باپ مر گیا ہو۔ مگر ساتھ ہی یہ تفصیل بھی ذہن میں رہنی چاہیے کہ۔

قَالَ اللَّیْثُ ھُوَ یَتِیْمٌ مَا لَمْ یَبْلُغِ الْحُلُمَ فَاِذَا بَلَغَ زَالَ عَنْہُ اِسْمُ الْیُتْمِ
وَقَالَ اَبُوْ سَعِیْدٍ یُقَالُ لِلْمَرْاَۃِ یَتِیْمَۃٌ لَا یَزُوْلُ عَنْھَا اِسْمُ الْیُتْمِ اَبَدًا وَاَنْشَدُوْا
وَیُنْکَحُ الْاَرَامِلُ الْیَتَامٰی : وَقَالَ اَبُوْ عُبَیْدَۃَ تُدْعٰی یَتِیْمَۃً مَا لَمْ تَتَزَوَّجْ فَاِذَا
تَزَوَّجَتْ زَالَ عَنْھَا اِسْمُ الْیُتْمِ ...... وَجَآءَ فِیْ حَدِیْثِ عُمَرَ رَضِیَ اللہُ عَنْہُ
قَالَتْ لَہٗ بِنْتُ خِفَافِ الْغِفَارِیِّ اِنِّیْ اِمْرَاَۃٌ مُّؤْتِمَۃٌ تُوُفِّیَ زَوْجِیْ۔ (تاج العروس ص۱۱۳ ج ۹)

لیث نے کہا ہے کہ لڑکا اس وقت تک یتیم کہلاتا ہے جب تک وہ بالغ نہ ہو جائے۔ چنانچہ جب لڑکا بالغ ہو جائے تو اس کے بعد اس کو یتیم نہیں کہا جاتا۔ ابو سعید نے کہا ہے کہ عورت کو برابر یتیمہ کہا جاتا ہے۔ اور اس سے یہ نام کبھی بھی ختم نہیں ہوتا۔ سند میں وہ لوگ یہ شعر پڑھتے ہیں کہ بیوہ عورتوں اور یتیم عورتوں کا نکاح کیا جاتا ہے۔ ابو عبیدہ نے کہا ہے کہ یتیم لڑکی کو اس وقت تک یتیمہ کہا جاتا ہے جب تک اس کی شادی نہ ہو جائے۔ چنانچہ جب اس کی شادی ہو جاتی ہے تو پھر اس کو یتیم نہیں کہا جاتا.....

حضرت عمرؓ کی حدیث میں آیا ہے کہ خفاف غفاری کی لڑکی نے ان سے عرض کیا تھا کہ میں ایک یتیم عورت ہوں کیونکہ میرا شوہر مر گیا ہے۔

اس اقتباس سے یہ چیز واضح ہو جاتی ہے کہ یتامیٰ کے مفہوم میں لغت اور زبان کے اعتبار سے

(۱) چھوٹے بچے جن کا باپ نہ رہا ہو۔

(۲) جوان کنواری لڑکیاں جن کے باپ مر گئے ہوں۔

(۳) بیوہ عورتیں جن کے شوہر مر گئے ہوں۔

سب داخل ہیں۔ لہٰذا آیت کا مطلب اب یہ ہوگا کہ

اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ یتیم بچوں اور بے باپ کی کنواری جوان لڑکیوں اور بیوہ عورتوں کے ساتھ تم عدل و قسط کا سلوک نہیں کر سکو گے تو تمہیں اجازت ہے کہ تم ان میں سے ان عورتوں سے جو تمہارے لئے حلال اور پسندیدہ ہوں۔ دو دو، تین تین، چار چار کی تعداد میں نکاح کر لو۔

ظاہر ہے کہ یہ حکم قرآن کے الفاظ میں عام نہیں ہے بلکہ مشروط ہے اور شرط یہ ہے کہ اگر ایسے حالات پائے جاتے ہوں کہ یتیم بچوں بے باپ کی کنواری یا بیوہ جوان لڑکیوں کے ساتھ عدل و قسط کا برتاؤ نہ کئے جا سکنے کا اندیشہ ہو۔ تو پھر ان عورتوں سے نکاح کرنے کے لئے تعدد ازدواج کی اجازت ہے۔ یہاں یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ "النساء" میں وہ عورتیں ہی مراد ہیں جو یتیم کنواری لڑکیاں یا بیوہ جوان عورتیں ہوں۔ کیونکہ "النساء" میں الف ولام آ رہا ہے۔ اس لئے اس سے لامحالہ وہی عورتیں مراد ہونگی جن کا اس سے پہلے تذکرہ آ چکا ہے۔ ان کے علاوہ کوئی دوسری عورتیں مراد نہیں ہو سکتیں۔ ہمارے مفسرین اور مترجمین نے اس نکتہ پر غور نہیں کیا اور اس طرح ترجمہ کر دیا ہے کہ "اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ یتیموں کے ساتھ عدل و انصاف کا سلوک نہیں کر سکو گے تو ان کے علاوہ دوسری عورتوں میں سے دو دو، تین تین، چار چار جو تمہیں پسند آئیں نکاح میں لے لو۔ حالانکہ یہ ترجمہ عربیت کی رُو سے بھی صحیح نہیں ہے۔ قرآن کی آیت میں کوئی لفظ موجود نہیں ہے جس کا ترجمہ "ان کے علاوہ دوسری عورتوں" کے الفاظ سے کیا جا سکے۔ لہٰذا اس قسم کا ترجمہ قرآن کریم پر اضافہ ہے۔ اگر قرآن کریم کا مقصد یہی ہوتا تو وہاں "فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِنْ نِّسَاءٍ اُخَرَ" کے الفاظ ہوتے۔ نِّسَاءٍ کے لفظ پر الف ولام لانے سے مقصد ہی یہ ہے کہ ان عورتوں کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے۔ جن کا ذکر یتامیٰ کے ضمن میں پہلے

آچکا ہے۔ جو کچھ کہا گیا ہے اسے سمجھنے کے لئے غالباً قرآن کریم کی یہ مثال زیادہ مفید ثابت ہوگی جس میں اسی ہیئت ترکیبی (CONSTRUCTION) کو اختیار کیا گیا ہے۔ رمضان کے روزوں کا تذکرہ کرتے ہوئے قرآن کریم میں کہا گیا ہے۔

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدَىٰ وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَن شَهِدَ مِنكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ۖ وَمَن كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ۗ (۲/۱۸۵)

رمضان کا مہینہ جس میں قرآن کو نازل کیا گیا ہے، لوگوں کے لئے ہدایت اور ہدایت کی واضح اور ممیز کن آیات پر مشتمل ہے لہٰذا تم میں سے جو شخص اس مہینہ (مذکورہ) میں اپنے گھر پر ہو وہ اس کے روزے رکھے اور جو شخص مریض یا مسافر ہو وہ دوسرے دنوں سے اس کی گنتی پوری کرے۔

اس آیت میں دیکھئے اَلشَّهْرُ سے مراد وہی مہینہ رمضان ہے جس کا پہلے ذکر آچکا ہے کوئی دوسرا مہینہ مراد نہیں ہے۔ اور اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ الشہر پر الف لام آیا ہے جس سے اس طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ مہینہ سے مراد وہی مہینہ ہے جس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ اور اسکے بعد جہاں ان دنوں کے علاوہ دوسرے دنوں سے گنتی پوری کرنے کا حکم دیا گیا ہے وہاں من الایام (الف ولام کے ساتھ) نہیں کہا گیا بلکہ من ایام (بغیر الف لام کے) کہا گیا ہے اور ساتھ ہی اُخَرَ کی قید بھی لگا دی گئی ہے۔ بعینہٖ اسی طرح اگر آیت نکاح میں یتیم اور بیوہ عورتوں کے علاوہ دوسری عورتیں مراد ہوتیں تو قرآن میں اَلنِّسَاءِ (الف لام) کے ساتھ نہ آتا بلکہ بغیر الف ولام کے نِسَاءٍ کہا جاتا بلکہ ساتھ ہی اُخَرَ کی قید بھی لگائی جاتی۔ یعنی مِنْ نِسَاءٍ اُخَرَ کہا جاتا۔

رہ گئی یہ بات کہ اگر قرآن کریم کا مطلب یہی کچھ ہے جو ہم نے بیان کیا ہے۔ تو قرآن کریم نے من النساء کا لفظ کیوں کہا من الیتامیٰ کا یا ممن کا لفظ کیوں نہ کہدیا؟ تو اس کی دو وجہیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے۔ یتامیٰ کے مفہوم میں نابالغ لڑکے اور لڑکیاں، یتیم بالغ اور کنواری لڑکیاں، اور بیوہ عورتیں سب شامل ہیں۔ اور نکاح ظاہر ہے کہ نابالغ لڑکیوں اور لڑکوں سے تو نہیں کیا جا سکتا تھا۔ بالغ عورتوں ہی سے کیا جا سکتا تھا۔ اس لئے من النساء کا لفظ کہنا ضروری تھا۔ یہاں اس نکتہ پر خصوصیت کے ساتھ غور فرمایئے کہ یتامیٰ کے مفہوم میں چونکہ نابالغ لڑکیاں بھی آجاتی تھیں جن سے نکاح کرنا تصریحات بالا کے مطابق جائز نہیں ہے۔ اس لئے من النساء کے لفظ سے ان نابالغ لڑکیوں کو بھی خارج کر دیا گیا۔ اور بتا دیا گیا کہ نکاح انہی سے کیا جا سکے گا جو النساء جوان عورتوں کی حد میں داخل ہو چکی ہوں۔ نابالغ لڑکیوں سے انہیں کیا جا سکیگا۔

قرآن کو شان نزول کا پابند نہیں کیا جا سکتا

عام طور سے حضرات علمائے کرام کی طرف سے قرآن پر اس اضافہ کے جواز میں جو وہ "ان عورتوں کے علاوہ دوسری عورتوں" کا ترجمہ کرتے ہیں بخاری کی وہ حدیث پیش کی جاتی ہے۔ جو حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ

عروہ بن زبیر نے حضرت عائشہ سے حق تعالیٰ کے اس ارشاد وَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تُقْسِطُوا فِي الْيَتَامَىٰ

کے متعلق سوال کیا تو حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ بھانجے! یہ یتیم لڑکی ہوتی تھی جو اپنے ولی کی پرورش میں ہوتی تھی اور اپنے ولی کے مال میں شریک ہوتی تھی۔ ولی کو اس کا مال اور اس کا حسن پسند آتا اور وہ چاہتا کہ خود اس سے نکاح کرلے۔ مگر مہر کے بارے میں وہ اس کے ساتھ انصاف نہیں کرتا تھا کہ اسے اتنا ہی مہر دے جتنا دوسرے لوگ دیتے۔ لہٰذا لوگوں کو ان یتیم لڑکیوں کے ساتھ نکاح کرنے سے روک دیا گیا مگر اس صورت میں کہ وہ ان کے ساتھ انصاف کا سلوک کرسکیں اور انھیں وہ بلند سے بلند مہر دے سکیں جو ان کے لئے ہونا چاہیئے تھا۔ اس لئے ایسے لوگوں کو حکم دیا گیا کہ وہ ان کے علاوہ دوسری عورتوں سے شادیاں کریں۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ لوگوں نے اس آیت کے بعد رسول اللہ صلعم سے سوال کیا تو خدا تعالےٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ وَيَسْتَفْتُونَكَ فِي النِّسَاءِ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ دوسری آیت میں حق تعالےٰ کا یہ ارشاد کہ وَتَرْغَبُونَ أَنْ تَنْكِحُوهُنَّ یہ اپنی یتیم لڑکی سے جبکہ اس کا مال اور حسن کم ہو نفرت اور بے رغبتی کا بیان ہے۔ لہٰذا ان یتیم عورتوں کے ساتھ نکاح کرنے کو بھی منع کردیا گیا جن کی طرف ان کے اولیاء کو ان کے مال وجمال کی وجہ سے رغبت ہوا کرتی تھی۔ مگر یہ کہ یہ اولیاء مہر کے معاملے میں انصاف کا برتاؤ کریں۔ کیونکہ جب ان عورتوں کے پاس مال اور حسن نہیں ہوتا تھا تو ان کے اولیاء ان سے شادی کرنے کی کوئی رغبت ظاہر نہیں کرتے تھے۔ (بخاری جزء سوم صـ۴۳ مطبوعہ مصر)

حضرت عائشہؓ کی اس حدیث سے جو آیت نکاح کا شان نزول بیان کرتی ہے یہ مطلب نکالا جاتا ہے کہ لوگ چونکہ اپنے زیر تربیت یتیم لڑکیوں سے کم مہر دے کر یا بلا مہر کے شادیاں کر لیتے تھے۔ اور اس طرح انصاف کا برتاؤ نہیں کرتے تھے۔ اس لئے آیت میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ اگر ایسی صورت ہے تو تم ان یتیم لڑکیوں سے شادیاں نہ کرو بلکہ ان کے علاوہ دوسری عورتوں سے شادیاں کرلیا کرو۔ اور وہ شادیاں دو دو تین تین چار چار کی تعداد میں کی جاسکتی ہیں۔

اس کا اصولی جواب تو یہ ہے کہ قرآن کریم کے الفاظ کو شانِ نزول کی روایات کا پابند نہیں بنایا جاسکتا کیونکہ قرآن کریم عہد رسول اللہ صلعم سے لے کر قیامت تک کے لئے ہدایت اور ضابطۂ حیات ہے۔ لہٰذا اسے چند واقعات کے ساتھ جکڑ بند نہیں کیا جاسکتا علمائے اصول اور فقہائے امت نے خود تصریح کی ہے کہ اَلْعِبْرَةُ بِعُمُومِ الْاَلْفَاظِ لَا بِخُصُوصِ الْمَوْرِدِ (الفاظ کے عموم کا اعتبار کیا جائے گا خاص واقعہ کا کوئی اعتبار نہیں کیا جائے گا) علاوہ ازیں اگر قرآن کریم کے معانی و مطالب کو شان نزول کی روایات کا پابند بنایا گیا تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ ہم قرآن کریم کے ایک قطعی حکم کو ظنی بنا دینا چاہتے ہیں کیونکہ شان نزول کی روایات بہرحال ظنی ہیں اور قطعی اور ظنی کے امتزاج سے جو نتائج برآمد ہوں گے وہ کبھی قطعی نہیں ہوسکتے۔ لہٰذا قرآنی احکام کی قطعیت کی حفاظت کے لئے بھی یہ ضروری ہے کہ قرآن کریم کی آیات کو شان نزول کی روایات کا پابند نہ کیا جائے۔

علاوہ ازیں اگر دقت نظر سے حضرت عائشہؓ کی اس حدیث پر غور کیا جائے تو وہ سرے سے اس آیت کا کوئی شان نزول

ہی بیان نہیں فرما رہی ہیں بلکہ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد جو واقعات پیش آئے ہیں ان کو بیان فرماتے ہوئے ایک دوسری آیت کے شان نزول کی طرف اشارہ فرما رہی ہیں۔ راویوں نے روایت بیان کرنے میں کس قدر اختصار سے کام لیا ہے جس سے بات واضح نہیں ہو سکی۔ حضرت عائشہؓ کا مطلب یہ ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو لوگوں نے اس قسم کی یتیم اور بیوہ لڑکیوں سے شادیاں کرنی شروع کر دیں۔ اور اس ضمن میں ایسے واقعات بھی پیش آئے کہ لوگوں نے مال اور حسن و جمال کے لالچ میں ان لڑکیوں سے شادیاں کر ڈالیں جو خود ان کے دامنِ تربیت میں پرورش پا رہی ہوتی تھیں۔ ان کے ساتھ انھوں نے یہ ناانصافی بھی شروع کر دی کہ یا تو ان کو وہ مہر میں کچھ دیتے ہی نہیں تھے۔ یا دیتے تھے تو بہت کم۔ اس قسم کے واقعات پیش آئے تو لوگوں نے رسول اللہ صلعم سے سوالات کئے کہ اس مشکل کا کیا حل ہونا چاہیئے چنانچہ قرآن کریم کی ایک دوسری آیت نازل ہوئی جو یہ ہے۔

وَيَسْتَفْتُونَكَ فِي النِّسَاءِ ۖ قُلِ اللَّهُ يُفْتِيكُمْ فِيهِنَّ ۙ وَمَا يُتْلَىٰ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتَابِ فِي يَتَامَى النِّسَاءِ اللَّاتِي لَا تُؤْتُونَهُنَّ مَا كُتِبَ لَهُنَّ وَتَرْغَبُونَ أَن تَنكِحُوهُنَّ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الْوِلْدَانِ ۙ وَأَن تَقُومُوا لِلْيَتَامَىٰ بِالْقِسْطِ ۚ وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ بِهِ عَلِيمًا ۝ (۴/۱۲۷)

اور اے پیغمبر اسلام! لوگ آپ سے عورتوں کے بارے میں حکم پوچھتے ہیں آپ کہہ دیجئے کہ اللہ اور کتاب اللہ کی وہ آیات بھی جو ان یتیم عورتوں کے بارے میں جنہیں تم وہ مہر ادا نہیں کرتے جو ان کے لئے مقرر کیا گیا ہو اور اس کے باوجود تم ان سے نکاح کرنے کے خواہشمند ہو اور کمزور ناتواں بچوں کے بارے میں تم پر تلاوت کی جاتی ہیں۔ یہی حکم دیتی ہیں کہ تم یتامیٰ کے لئے انصاف اور قسط کو قائم کرو اور جو کچھ تم بھلائی کرو گے تو یقیناً اسے خدا اچھی طرح جانتا ہے۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ اس آیت نے یہ بات صاف کر دی کہ ان یتیم اور بیوہ لڑکیوں سے جو تمہارے دامنِ تربیت میں پرورش پا رہی ہوں محض مال اور حسن کے لالچ کی وجہ سے نکاح نہیں کیا جا سکتا۔ یا تو ان کے ساتھ پورے پورے عدل اور قسط کا سلوک کرو اور ان کو ان کا پورا پورا مہر ادا کر دو، ورنہ ان یتیم اور بیوہ لڑکیوں کے ساتھ جو تمہارے زیر تربیت ہوں خود نکاح ہی نہ کرو۔ کیونکہ اس صورت میں دباؤ، دھاندلی اور ظلم کا زیادہ اندیشہ ہے بلکہ ان کے علاوہ دوسری یتیم اور بیوہ لڑکیوں سے نکاح کرو جو تمہارے زیر اثر نہ ہوں اور جن کے ساتھ تم اس قسم کی ناانصافیاں نہ کر سکو۔ البتہ اگر تم ایسی یتیم اور بیوہ لڑکیوں کے ساتھ بھی جو تمہارے زیر تربیت ہوں عدل اور قسط کا سلوک کر سکو اور ان کو ان کا پورا پورا مہر ادا کر دو تو ان سے شادی کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔

لہٰذا حضرت عائشہؓ کی یہ حدیث دراصل آیت (۴/۱۲۷) کا شان نزول بیان کر رہی ہے۔ آیت نمبر (۴/۳) کا شان نزول نہیں بیان کر رہی۔ اس تفصیل کے بعد یہ امر بھی بخوبی سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ حضرت عائشہؓ کی حدیث میں سِوَاهُنَّ سے مراد اپنے زیر تربیت یتیم اور بیوہ لڑکیوں کے علاوہ دوسری یتیم اور بیوہ لڑکیاں ہیں جو دوسروں کے دامنِ تربیت میں پرورش پا رہی ہوں اور

جن کے ساتھ اس قسم کی بے انصافیوں اور دھاندلی بازیوں کا اندیشہ نہ ہو۔ یتیم اور بیوہ لڑکیوں کے علاوہ عام عورتیں مراد نہیں ہیں جیسا کہ ہمارے علماء کرام نے سمجھا ہے۔

بہرحال حضرت عائشہؓ کی اس حدیث میں قرآن کریم کی دونوں آیتوں کو سامنے رکھکر صورت حال اور اس کے متعلق رسول اللہ صلعم کا فیصلہ بیان کیا گیا ہے چنانچہ حدیث میں دونوں آیتوں کا حوالہ موجود ہے مگر اختصار کی وجہ سے بات صاف نہیں ہو سکی مگر اس تفصیل کے بعد جو ہم نے بیان کی ہے حضرت عائشہؓ کی حدیث کا دوبارہ مطالعہ کیجئے اور دیکھئے کہ بات وہی کچھ ہے جو ہم نے بیان کی ہے یا اس کے علاوہ کچھ اور ہے اگر یہ مطلب نہیں ہے جو ہم نے بیان کیا ہے تو آپ کو ماننا پڑے گا کہ حدیث مذکورۃ الصدر میں آیت (۴/۱۲۷) کے حوالہ کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی اور اس کا تذکرہ وہاں بالکل ہی بے جوڑ ہے۔

تعدد ازدواج اور اسلاف

یہاں یہ سوال کیا جاتا ہے کہ صحابہ کرام کے عہد سے لے کر آج تک ہمارے بزرگ تعدد ازدواج کے قائل چلے آئے ہیں تو کیا انہوں نے قرآن کریم کی اس آیت کا صحیح مطلب نہیں سمجھا تھا اور کیا یہ تمام حضرات غلط اور ناجائز طور پر متعدد نکاح کرتے چلے آئے ہیں؟ یہ سوال اپنی جگہ پر بڑا اہم ہے مگر اس کی نوعیت دینی نہیں ہے۔ تاریخی ہے۔ آپ مسلمانوں کی تاریخ کا مطالعہ کیجئے۔ حضرت عثمانؓ کے عہد تک فتوحات اسلامیہ کا سلسلہ برابر جاری رہا اور مختلف محاذوں پر اسلامی افواج سرگرم نبرد آزمائی رہیں جس میں آئے دن مسلمان مرد شہید ہوتے اور بیوہ اور یتیم لڑکیوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہتا تھا۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے واقعہ فاجعہ کے بعد خود مسلمانوں کے درمیان تلواریں چل نکلیں۔ جنگ جمل، جنگ صفین، واقعہ حرہ، اور عبدالملک اور عبداللہ بن الزبیر کی جنگ۔ خارجیوں کے خلاف حضرت علیؓ کی جنگیں۔ اس کے بعد بنوامیہ اور بنوعباس کی آویزشیں، ان خانہ جنگیوں کے نمونے تھے جن میں لاکھوں مسلمان دونوں طرف سے برابر شہید ہوتے رہتے اور یتیم اور بیوہ لڑکیوں کی تعداد میں اضافہ کا باعث بنتے رہتے تھے۔ ان المناک حادثات کے ہوتے ہوئے یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ گذشتہ حالات کی تلافی ہو گئی ہو گی اور اب امت مسلمہ میں یتیم اور بیوہ لڑکیوں کا کوئی مسئلہ ہی باقی نہیں رہا ہو گا۔ خلافت عباسی کے استحکام کو کچھ عرصہ اطمینان کے ساتھ گذر جاتا تو اس قسم کے حالات پیدا ہو سکتے تھے کہ یہ مسئلہ نظر ثانی کا محتاج ہوتا مگر عباسی خلافت کو وہ استحکام کچھ زیادہ عرصہ نصیب نہ ہو سکا۔ آئے دن علویوں اور فاطمیوں کی طرف سے بغاوتیں ہوتی رہتی تھیں ان سے کچھ نجات ہوئی تو ترکیوں اور ایرانیوں اور عربوں کی آویزشیں شروع ہو گئیں کچھ فرقہ وارانہ فسادات نے خوفناک شکلیں اختیار کیں۔ غرضیکہ مسلمانوں کی ہزار سالہ تاریخ اسی اندرونی آویزشوں سے پر چلی آتی ہے۔ لہٰذا یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس عرصہ میں وہ کون سی صدی آئی ہو گی جن میں اسلامی معاشرہ ان ہنگامی حالات سے دوچار نہیں رہا ہو گا۔ جب تک مسلمانوں کے ہاتھوں میں حکومت و اقتدار رہا وہ برابر اغیار سے یا خود اپنوں سے نبرد آزما رہے البتہ اب چند صدیوں سے حکومت و سلطنت کو کھو چکنے کے بعد ایسے حالات ضرور پیدا ہوئے ہیں کہ اسلامی معاشرہ میں عورتوں اور مردوں کی تعداد میں کسی نہ کسی حد تک توازن اور یکسانیت پیدا ہوئی ہے اور ماضی کے ان ہنگامی حالات کی کسی حد تک تلافی ہو سکی ہے۔ اور جس دن سے حالات نے یہ پلٹا

گیا ہے اس وقت سے حساس طبیعتیں برابر کوشش کر رہی ہیں کہ ان مسائل پر نظرِ ثانی کی جا سکے۔ لیکن صدیوں کے بعد جب مسلمانوں پر جمود و خمود کے گہرے بادل چھا چکے تھے۔ اور ملتِ مسلمہ کا کارواں اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مار رہا تھا ان تمام بادلوں کو ایک دم نہیں ہٹایا جا سکتا تھا۔ مسلمانوں پر عرصہ دراز سے جامد تقلید چھائی ہوئی تھی۔ اولاً اس کے خلاف آواز بلند ہوئی اور ہر طرف حدیثِ رسول کا شور برپا ہوا اور غیر مقلدین یا اہلِ حدیث کا ایک فرقہ پیدا ہو گیا۔ ائمہ فقہ کی تقلید کا بت ٹوٹا تو حدیثِ رسول کے نام سے ائمہ حدیث کی تقلید شروع ہو گئی۔ بالآخر اس کے مفاسد کچھ عرصے کے بعد سامنے آنا شروع ہوئے تو آہستہ آہستہ قرآن کی آواز بلند ہونا شروع ہوئی اور ہمارے دور میں ائمہ حدیث کا طلسم بھی ٹوٹ رہا ہے اور ملتِ اسلامیہ قرآن کریم کے قریب تر آتی جا رہی ہے۔ لیکن جو حضرات دین میں اپنے آپ کو (AUTHORITY) سمجھتے ہیں وہ اس نظرِ ثانی کے مطالبے کے راستے میں سنگِ گراں بنے ہوئے ہیں۔ وہ خالی الذہن ہو کر نہ قرآن کو سمجھنا چاہتے ہیں۔ اور نہ ہی زمانہ کے تقاضوں کو، اور نہ ان کے مطابق اپنی سابقہ روش میں کسی تبدیلی کے لئے تیار ہیں۔

بہرحال کہنے کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کی ہزار سالہ تاریخ کچھ اس قسم کی گذری ہے کہ خصوصیت کے ساتھ اس مسئلہ پر نظرِ ثانی کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی کیونکہ جن ہنگامی حالات میں تعددِ ازدواج کی اجازت دی گئی تھی وہ ہنگامی حالات بدستور اسلامی سوسائٹی پر مسلط رہے۔ البتہ جب سے حالات نے پلٹا کھایا ہے۔ اس وقت سے برابر مذہب کے موجودہ ڈھانچے میں تبدیلی و اصلاح و ترمیم کی کوشش کی جا رہی ہیں۔ لیکن علمائے کرام کا ایک مخصوص طبقہ اپنی کوتاہ نگہی یا ذاتی مفادات کی خاطر مسلمانوں کو اس نہج پر سوچنے سے روکے ہوئے ہے ورنہ اس قسم کی تبدیلیاں کبھی کی ہو چکی ہوتیں جو کچھ اوپر کہا گیا ہے۔ اگر اس کے بعد بھی کوئی یہ کہے کہ ہمیں تاریخ میں ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ لوگوں نے بغیر مخصوص حالات کی شرط کے ایک سے زائد شادیاں کیں اور وہ ان مثالوں کو بالکل یقینی سمجھتے ہیں تو اس باب میں با ادب گذارش ہے کہ ہماری تاریخ میں کتنی باتیں ایسی ملتی ہیں جو یکسر اسلام کے خلاف ہیں لیکن ان ہزار سال میں مسلسل و متواتر چلی آ رہی ہیں۔ ایک ملوکیت ہی کو لیجئے کیا اس کے خلافِ اسلام ہونے میں دو آرا بھی ہو سکتی ہیں؟ لیکن اس کے باوجود کیا یہ بھی حقیقت نہیں کہ ہماری اس ہزار سال کی تاریخ میں ملوکیت ایک مسئلہ کی حیثیت سے چلی آ رہی ہے اور کسی نے اسکے خلاف لب کشائی تک نہیں کی۔ آج بھی جہاں جہاں ملوکیت موجود ہے ہمارے علماء ان کے خلاف ایک لفظ تک نہیں کہتے۔ لہٰذا یہ دلیل کہ ایسا ہزار سال سے ہوتا چلا آ رہا ہے کسی چیز کو اسلامی نہیں بنا دیتا۔ کسی چیز کا اسلامی ہونے کے لئے اس کا خدا کی کتاب کے مطابق ہونا بنیادی شرط ہے

قرآنی فیصلے

روزمرہ کی زندگی کے سانحہ اہم مسائل و معاملات پر قرآنی روشنی میں بحث

٤٠٨ صفحات —— قیمت:۔ چار روپے

کام محنت سے
کھیل ہمت سے

تھکانے والے کام اور تھکانے والے کھیل ، بہت سی محفوظ طاقت چاہتے ہیں جو معمولی خوراک سے حاصل نہیں ہوتی ۔ ایسے مشاغل والوں کو اوولٹین ضروری فاضل غذائیت بہم پہنچاتی ہے جس سے جسم دماغ اور اعصاب تقویت پاتے ہیں ۔ اگر آپ روزانہ زندگی چست اور خوش آئند طریق پر گذارنا چاہتے ہیں تو اسکے لئے بہترین سامان اوولٹین ہی مہیا کرتی ہے ۔

طاقت اور توانائی کے حصول کے لئے خوش ذائقہ

اوولٹین
استعمال کیجئے

OVALTINE

تقسیم کنندگان :- گریہم ٹریڈنگ کمپنی (پاکستان) لمیٹڈ ۔ کراچی اور چٹاگانگ

P.459

سب کی پسند
مسواک
ٹوتھ پیسٹ
MISWAK
MAKES TEETH PEARLY WHITE

حقائق و عبر

مستقبل کا مذہب

۵ دسمبر کی شام، ریڈیو پاکستان سے عصر حاضر کے مشہور مؤرخ ڈاکٹر آرنلڈ ٹوئن بی کی، ایک ریکارڈ کردہ تقریر نشر ہوئی جس میں انہوں نے منجملہ دیگر امور، مذہب کے متعلق اپنے خیالات کا ان الفاظ میں اظہار کیا۔

دورِ حاضر کی روح میں جو خلا پیدا ہو گیا ہے وہ اسے کس طرح سے پُر کرے گا؟ یہ خلا، سائنس کی ترقی کا پیدا کردہ ہے۔ سائنس نے روایتی مذہب کو میدان سے نکال باہر کیا ہے۔ لیکن سائنس اس خلا کو پُر نہیں کر سکتی (جو خود اس کا پیدا کردہ ہے) سائنس نے انسان کو خارجی کائنات اور خود انسان کے جسم پر ایسا کنٹرول عطا کیا ہے۔ جس کی نظیر اس سے پیشتر کہیں نہیں ملتی۔ لیکن سائنس اس بات میں انسان کی کوئی مدد نہیں کر سکتی کہ وہ خود اپنی ذات پر کس طرح کنٹرول رکھے اور حقیقت یہ ہے کہ انسانی زندگی کا سب سے اہم مسئلہ یہی ہے کہ وہ اپنے آپ پر کس طرح کنٹرول رکھے۔ یہ مسئلہ اہم بھی ہے اور فوری توجہ کا مستحق بھی۔ فوری توجہ کا اس لئے کہ خارجی کائنات پر انسان کا کنٹرول بہت زیادہ وسیع ہو گیا ہے جس کی وجہ سے انسان کی حالت آج ایسی ہو چکی ہے جیسے بچے کے ہاتھ میں چاقو دے دیا جائے۔ یعنی ایسے انسان کو جسے ذہنی پختگی حاصل نہ ہوئی ہو ایسے ہتھیار دے دیئے جائیں۔ جن کے استعمال کے لئے بہت زیادہ ذہنی اور قلبی پختگی کی ضرورت ہو۔ ظاہر ہے کہ ایسا انسان دوسرے انسانوں کے لئے اور خود اپنے آپ کے لئے بھی بے حد خطرناک ثابت ہو گا تاوقتیکہ وہ روحانی طور پر اتنا آگے نہ بڑھ جائے کہ وہ ان ہتھیاروں کا صحیح استعمال کر سکے۔ لیکن روحانی پختگی سائنس کے ذریعے حاصل نہیں ہو سکتی۔ مذہب کے ذریعہ حاصل ہو سکتی ہے۔ بنا بریں، میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ بیسویں صدی کا انسان مذہب کی تلاش میں نکلے گا۔ اور مجھے اس کا یقین ہے کہ وہ اپنی تلاش میں کامیاب ہو گا۔ اور مذہب کو پالے گا۔ لیکن وہ نیا مذہب اس کے روایاتی مذاہب سے اس قدر مختلف ہو گا کہ پہلی نظر میں وہ شاید پہچانا بھی نہ جا سکے۔

اس کے بعد ڈاکٹر موصوف کہتا ہے۔

وہ کون سی کسوٹی ہو گی جس پر پرکھ کر یہ معلوم کیا جا سکے کہ یہ نیا مذہب فی الواقعہ سچا مذہب ہے۔ اس کی

کسوٹی یہ ہوگی کہ یہ مذہب انسانی مصائب و مشکلات کو حل کرنے کی قدرت اپنے اندر رکھے گا۔ اگرچہ ہماری آنے والی مشکلات موجودہ مشکلات سے بھی بڑھ چڑھ کر ہوں گی۔

(ٹائمز آف کراچی مورخہ ۲ دسمبر ۱۹۵۶ء)

ظاہر ہے کہ جب موجودہ روایاتی مذہب مٹ جائیں گے (اور مٹنا ان کے لئے مقدر ہے) تو دنیا میں خدا کی وحی (جو حقیقی دین کی ضامن ہوسکتی ہے) قرآن کے علاوہ اور کہیں نہیں ملے گی۔ اس لئے مستقبل کا مذہب وہ دین ہوگا جسے قرآن نوع انسانی کے لئے تجویز کرتا ہے۔ یہ دین فی الواقعہ مروجہ مذاہب سے مختلف ہوگا (اور مروجہ مذاہب میں ظاہر ہے کہ خود ہمارا مروجہ مذہب بھی شامل ہے جو قرآن پر مشتمل نہیں ہے) اس دین میں اس کی صلاحیت ہے کہ وہ نوع انسانی کی تمام مشکلات کا اطمینان بخش حل پیش کرسکے اس لئے کہ اس نے خود یہ کہا ہے کہ

وَاَمَّا مَا یَنْفَعُ النَّاسَ فَیَمْکُثُ فِی الْاَرْضِ (۱۳/۱۷)

دنیا میں بقا اسی کے نصیب ہوسکتی ہے جو نوع انسانی کے لئے منفعت بخش ہو۔

اس لئے وہ سب سے پہلے یہ کرے گا کہ رزق کے سرچشموں کو تمام ضرورت مندوں کے لئے یکساں طور پر کھلا چھوڑ دے گا اور پوری نوع انسانی کو ایک عالمگیر برادری قرار دے کر تمام افراد انسانیہ کی نشو و نما کے اسباب و ذرائع مہیا کرے گا۔

طلوع اسلام اسی قرآنی دین کے احیاء کے لئے کوشاں ہے۔ زمانے کے تقاضے اس پر شاہد ہیں کہ یہ دین متمکن ہوکر رہے گا اس کے بغیر انسانیت رہ ہی نہیں سکتی۔

۲۔ "بنا سپتی نبوت" کے ستون

دوسری جنگ عظیم کے دوران میں "مرزا محمود احمد صاحب" خلیفہ قادیان نے ایک الہامی بیان، ۲۸ جون ۱۹۴۰ء کے اخبار الفضل میں شائع کیا تھا۔ ملاحظہ فرمائیے:

انگریزوں کی مثال درحقیقت ایسی ہی ہے جیسے کہ قرآن کریم میں آتا ہے کہ دو یتیم بچوں کا خزانہ ایک دیوار کے نیچے دبا ہوا تھا۔ ایک مدت کے بعد دیوار بوسیدہ ہوکر گرنے کے قریب ہوگئی۔ مگر حضرت موسیٰ اور ان کے ساتھی نے اس دیوار کو پھر بنا دیا۔ اسی طرح بظاہر حالات سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انگریز اور فرانسیسی وہ دیواریں جس کے نیچے احمدیت کی حکومت کا خزانہ مدفون ہے اور خدا تعالےٰ چاہتا ہے کہ یہ دیوار (یعنی فرانس اور برطانیہ) اس وقت تک قائم رہے جب تک خزانہ کے اصل حقدار جوان نہیں ہوجاتے۔ ابھی احمدیت چونکہ بالغ نہیں ہوئی ہے اور بالغ نہ ہونے کی وجہ سے وہ اس خزانہ پر قبضہ نہیں کرسکتی اس لئے اگر اس وقت یہ دیوار گر جائے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ دوسرے لوگ اس پر قبضہ جما لیں گے۔ پس اللہ تعالےٰ چاہتا ہے کہ ہم پھر ایسی دیوار بنا دیں، تاجب احمدیت اپنی بلوغت کاملہ کو پہنچ جائے تو اس وقت وہ اس خزانہ کو سنبھال لے۔ پس

اس وقت احمدیت کا فائدہ انگریزوں کی فتح میں ہے۔ حضرت مسیح موعود نے بھی دعا کی ہے کہ اللہ تعالیٰ جنگ میں انگریزوں کو فتح دے۔ پس حضرت مسیح موعود کی سنت کی اتباع میں ہمارا فرض ہے کہ ہم انگریزوں کی کامیابی کے لئے دعا کریں۔ اس وقت انگریزوں یا فرانسیسیوں کا سوال نہیں بلکہ احمدیت کی تبلیغ کی آزادی کا سوال ہے۔ پس نہایت ہی درد اور کرب کے ساتھ دعا کریں۔ کیونکہ معاملہ معمولی نہیں بلکہ نہایت ہی خطرناک ہے۔

(بحوالہ نوائے پاکستان۔ ۱۳ر دسمبر ۱۹۵۶ء)

سچ کہا تھا حکیم الامت نے کہ

اگر ایں آب و جلبے از فرنگ است ۔ جبینِ خود مسنر جز بر درِ او

سرِیں راہم بہ جوشش دہ کہ آخر ۔ حقے دارد بہ حسنِ پالاں گراد

کیا آپ نے یہ کتابیں دیکھی ہیں؟

جشن نامے ایسے عنوانات جنھیں پڑھ کر ہونٹوں پر مسکراہٹ بھی ہو اور آنکھوں میں آنسو۔ طنز اور تنقید کے گہرے نشتر۔ سات سالہ دورِ آزادی کی سمٹی ہوئی تاریخ۔ ۲۵۶ صفحات۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے

مزاج شناس رسول یہ کون بتائے کہ صحیح احادیث کونسی ہیں اور غلط کونسی! مزاج شناس رسول۔ مزاج شناس رسول کون ہیں؟ اس کی تفصیل اس کتاب میں ملے گی۔ قیمت چار روپے

مقامِ حدیث حدیث کے متعلق تمام اہم سوالات کے تفصیلی جوابات۔ احادیث کے متعلق اتنی معلومات کسی جگہ یکجا نہیں ملیں گی۔ دو جلدیں۔ ہر جلد کے قریباً چار سو صفحات۔ اور قیمت فی جلد چار روپے

نوادرات از:- علامہ اسلم جیراجپوری
علامہ موصوف کے مضامین کا نادر مجموعہ
بڑا سائز ۴۰۰ صفحات۔ قیمت چار روپے

اسلامی معاشرت از:- پرویز
مسلمانوں کے عادات و اخلاق کا خاکہ، رہنے سہنے کے ڈھنگ۔ سرکاری ملازمین کے فرائض و واجبات۔ انفرادی و اجتماعی زندگی کا ہر اسلوب قرآنی آئینہ میں۔ ۱۹۲ صفحات۔ قیمت دو روپے

(محصول ڈاک ہر حالت میں بذمہ خریدار ہوگا)

ملنے کا پتہ:- ناظم ادارۂ طلوع اسلام ۔ ۱۵۹/۳۔ ایل (بی۔ای۔سی ہاؤسنگ سوسائٹی) کراچی ۲۹

تین نئی کتابیں

۱۔ طاہرہ کے نام خطوط

قارئین کو یہ معلوم کرکے خوشی ہوگی کہ طاہرہ کے نام خطوط کا مجموعہ بھی اب پریس میں جا رہا ہے۔ پڑھنے والوں کی سہولت کی غرض سے اسے دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ حصہ اول میں قریب دس خطوط ہیں حصہ دوم میں بقایا خطوط اور ان کے ساتھ میرج کمیشن کے سوالنامہ کا جواب۔ اس کے بعد ایک نہایت مفید باب ہے۔ محترم پرویز صاحب نے قرآن کریم کے ان تمام احکامات کو جو عورتوں (عائلی زندگی) سے متعلق ہیں مختلف عنوانوں کے تحت مربوط مضامین کی شکل میں یکجا کر دیا ہے یہ تمام مضامین اس باب میں آگئے ہیں۔ اس اعتبار سے کتاب ایک نادر مجموعہ بن گئی ہے جس کی روشنی میں ہماری بچیاں اور بہنیں اپنے حقوق و فرائض کے متعلق وہ سب کچھ معلوم کر لیں گی جو قرآن میں بیان ہوا ہے۔

ہر حصہ قریب سوا دو سو صفحات پر مشتمل ہوگا اور قیمت فی حصہ دو۔ اڑھائی روپے کے درمیان۔ اپنی فرمائشیں جلد بھیج دیجئے اور اس بات کی تصریح کر دیجئے کہ آپ ایک ہی حصہ چاہتے ہیں یا دونوں۔

۲۔ برقِ طور

جمعے لوز کے بعد اب برقِ طور شائع ہو رہی ہے۔ جس میں حضرت موسیٰؑ سے لیکر حضرت زکریاؑ سے قبل کے انبیائے بنی اسرائیل کا تذکار جلیلہ آگیا ہے۔ یہ کتاب اس اعتبار سے بڑی اہم ہے کہ اس میں قوموں کے عروج و زوال کے ابدی قوانین، داستانِ بنی اسرائیل کی شکل میں ابھر کر سامنے آجاتے ہیں۔

کتاب قریب ساڑھے تین سو صفحات پر مشتمل ہے۔

۳۔ تاریخ الامت حصہ ششم

یہ کتاب ایک عرصے سے پریس میں رکی ہوئی تھی۔ بائے اب چھپ گئی ہے۔ اور عنقریب شائع ہو جائے گی۔ اس کے بعد ساتویں اور آٹھویں حصہ کی اشاعت سے تاریخ الامت کے سلسلہ کی تکمیل ہو جائے گی۔

یہ تینوں کتابیں پیشگی خریداران کی خدمت میں از خود بھیجدی جائیں گی۔ بجز ان حضرات کے جو اس امر کی اطلاع دیدیں کہ انہیں فلاں کتاب درکار نہیں۔ باقی حضرات اپنی اپنی فرمائشیں جلد بھیجدیں۔ ان کی تعمیل فرمائشیں موصول ہونے کی ترتیب سے کی جائے گی۔

ناظم ادارۂ طلوع اسلام

۳/۱۵۹۔ ایل (پی۔ ای۔ سی ہاؤسنگ سوسائٹی) کراچی ۲۹

نقد و نظر

۱۔ نقوش۔ شخصیات نمبر ۲

پچھلے سال لاہور سے شائع ہونیوالے ماہنامہ "نقوش" نے اپنا شخصیات نمبر شائع کیا تھا۔ اس سال اس نے اسی نمبر کا دوسرا حصہ شائع کیا ہے۔ پہلا حصہ قریب سات سو صفحات پر مشتمل تھا (اور اس پر ہفتہ وار طلوع اسلام کی ۱۲ مارچ ۱۹۵۵ء کی اشاعت میں تبصرہ کیا گیا تھا) یہ دوسرا حصہ قریب آٹھ سو صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ اس کی قیمت آٹھ روپے ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ نقوش کی یہ ہمت اس لحاظ سے قابل قدر ہے کہ اس نے عصر رواں کی اس قدر متنوع ہستیوں کے کوائف حیات یک جا جمع کر دیئے۔ لیکن اس حصہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے ہاں اب اشخاص تو ہیں، شخصیتوں (PERSONALITIES) کا دور اب سے کچھ عرصہ پہلے قریب قریب ختم ہو گیا تھا۔ اس حصہ میں بھی جو حضرات اُس دور سے متعلق ہیں ان کی زندگی میں شخصیت کی جھلک ملتی ہے۔ باقی اشخاص ہی اشخاص ہیں۔ قوموں کی پستی کے دور میں یہی ہوتا ہے۔ اشخاص بہت زیادہ شخصیتیں شاذ و نادر۔ یہ بہرحال "نقوش" کا قصور نہیں۔ ہمارے دور کی کمی ہے۔ یہ البتہ نقوش کا قصور ہے کہ اس نے بعض پیروں کی کہانیاں ان کے مریدوں سے لکھوا کر شائع کر دیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ ہر مرید اپنے پیر کے متعلق یہی کہے گا کہ

> اگر ہم ہمالیہ کی چوٹی پر کھڑے ہو کر ارض پاک کے آدمیوں پر نگاہ ڈالیں تو شاید پہلی نگاہ اسی شخصیت کے حصے میں آئے گی۔

سنجیدہ نوشتوں میں اس قسم کی عقیدتمندیوں کو بار نہیں پانے دینا چاہیئے۔

محترم ابوالخیر مودودی صاحب نے اس شمارہ میں بھی ایک شگفتہ مقالہ لکھا ہے۔ ان کے علاوہ، یہ دیکھ کر بھی حیرت اور مسرت ہوئی کہ حکیم نیر واسطی صاحب اس قدر کیف بار دلنشاط آور قلم کے مالک ہیں۔ اختر شیرانی کا حق تھا کہ اس پر اسی انداز سے جھومتے ہوئے لکھا جائے۔ شخصیت کے اعتبار سے ہمارے نزدیک اس مجموعہ کا حاصل نواب وقار الملک پر مہر صاحب کا مقالہ ہے۔ قارئین سے اس کا تفصیلی تعارف کسی آئندہ اشاعت میں کرایا جائے گا۔

۲۔ نوائے فردا

حکومت پاکستان کی وزارت مواصلات میں ایک صاحب نائب مشیر مالیات کے عہدہ پر فائز ہیں۔ شیخ محمد ایوب نام۔ عربی۔ فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں کافی دستگاہ۔ ذوق نہایت شستہ۔ طبع بڑی سلیم

برسوں ساتھ رہنے والوں میں سے بھی بہت کم ایسے ہوں گے جنہیں یہ معلوم ہو کہ وہ شعر بھی کہتے ہیں۔ حالانکہ شعر ایسے پاکیزہ کہتے ہیں کہ اس دور میں باید وشاید۔ اقبالؒ سے انہیں عشق ہے۔ ایسا عشق کہ انہوں نے شعر میں قدم قدم پر ان کی اتباع کو اپنا شعار بنالیا ہے اس کا نتیجہ "نوائے فردا" کی شکل میں ہمارے سامنے ہے۔ اس میں ایوب صاحب نے "زبور عجم" کے شعر پر شعر اور غزل پر غزل کہی ہے۔ اسی زمین۔ اُسی قافیہ اور اسی ردیف میں۔ مضامین بھی وہی اور اصطلاحات و تراکیب (حتیٰ کہ تشبیہات و استعارات بھی وہی (گوشۂ زمانہ جدید کا حصہ اس میں نہیں ہے)

اس میں شبہ نہیں کہ جہاں تک ایوب صاحب کے اپنے ذوق کا تعلق ہے، اس سے اس کی تسکین ضرور ہوگئی ہوگی لیکن سوال یہ ہے کہ ان کی اس کوشش اور محنت سے قوم کو کیا فائدہ پہنچا؟ ظاہر ہے کہ ان نظموں میں پیغام وہی ہے جو اقبالؒ نے دیا ہے اسلئے اس اعتبار سے ہمارے ملی سرمایہ میں اس سے کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ اور (اس قدر کوشش کے باوجود) ان میں اقبالؒ کی سی بلندی اور گہرائی پیدا نہیں ہو سکی اور نہ ہی ہو سکتی تھی۔ اسلئے کہ ابھی وقت چاہیئے کہ کوئی اقبال کی سی فکر کی بلندی اور احساسات کی گہرائی تک پہنچ سکے۔ لہٰذا اس اعتبار سے اس کا پایہ زبور عجم سے یقیناً کمتر ہے۔ بنا بریں زبور عجم کی موجودگی میں "نوائے فردا" کے مطالعہ سے کیا حاصل ہو سکتا ہے؟ مثلاً زبور عجم کی مشہور نظم ہے۔ یا چناں کن یا چنیں۔ اس زمین میں ایوب صاحب کی نظم کے ایک دو بند ملاحظہ فرمائیے۔

اے مسلماں یا بروں نہ پائے خود را از حرم — یا قیامے در حدود آں بصدق دل گزیں
یا چناں کن یا چنیں
یا بکن از تیشۂ تفریق خود را ریز ریز — یا بشو باہمرہاں وابستۂ حبل المتیں
یا چناں کن یا چنیں

اقبالؒ کی نظم اور اس میں جو بین فرق ہے وہ ارباب ذوق و نظر سے پوشیدہ نہیں۔ فطرت نے ایوب صاحب کو عمدہ صلاحیتیں دی ہیں۔ ہمارا مخلصانہ مشورہ ہے کہ وہ ان صلاحیتوں کو کسی تخلیقی کام میں صرف فرمائیں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ شاعر پر جذبات کا اس قدر غلبہ ہوتا ہے کہ اس قسم کے مشورے اس کے نزدیک درخور اعتنا نہیں ہوتے اگر کہیں ہمارے شاعر جذبات سے الگ ہٹ کر سوچنا شروع کر دیں تو ہزاروں شاعر آج ہی شاعری چھوڑ دیں۔

"نوائے فردا" زبور عجم کی تقطیع اور انداز پر فیروز سنز نے شائع کی ہے۔ اور مجلد کی قیمت پانچ روپے ہے۔

اسلام اور موسیقی

انسان اور حیوان میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ انسان کے تقاضے صرف طبعی جسم کے نہیں۔ یہ ذوق حسن وزیبائی بھی رکھتا ہے۔ حسن صحیح تناسب کا نام ہے اور چونکہ انسانی ذات کی نشوونما کے معنی یہ ہیں کہ اس کی مختلف صلاحیتوں کی نمود اس انداز سے ہو کہ اس میں کامل ہم آہنگی اور تناسب قائم رہے، اس لئے تحسین حسن انسانی

ذات کی بنیادی خصوصیت ہے۔ قرآن جو انسان کی تمام نشوونما کا ضابطہ ہے وہ بھلا زندگی کے جمالیاتی پہلو کو کس طرح نظر انداز کر سکتا تھا۔ اس نے ان لوگوں کو جو زندگی کے زینت افزا پہلوؤں کو "روحانیت" کا حریف سمجھتے تھے للکارا اور کہا کہ ان سے پوچھو کہ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ (۷/۳۲) کون ہے جو ان زینت کی چیزوں کو جنہیں اللہ نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کیا ہے حرام قرار دیتا ہے؟

قرآن نے یہ کہا تھا لیکن جب قرآن نگاہوں سے اوجھل ہو گیا اور اس کی جگہ انسانوں کے خود ساختہ مذہب نے لی تو ہمارے ارباب مذہب نے خدا کے اس چیلنج کا بڑے دھڑلے سے جواب دیا اور کہا کہ ہم ہیں جو زینت کی ہر قسم کی چیزوں کو حرام قرار دیتے ہیں! یوں ہمارے ہاں فطرت کا ہر حسین اور شگفتہ گوشہ شجرِ ممنوعہ قرار پا گیا۔ اور فنونِ لطیفہ کو گہری قبروں میں دبا دیا گیا۔ لیکن انسانی تقاضوں کو کیا کیا جائے وہ کہیں اس طرح دبائے دبتے ہیں! ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ

پری رو تابِ مستوری ندارند   چو در بندی ز روزن سر برآرند

وہ کسی نہ کسی شکل میں باہر آتے ہیں۔ چنانچہ ہمارے ہاں جب ان تقاضوں نے سر ابھارا تو خود اپنے ہاتھوں سے عائد کردہ پابندیوں میں جواز کی راہیں تلاش ہونا شروع ہو گئیں۔ اب کہا یہ گیا کہ مصوری حرام ہے لیکن صرف جاندار اشیاء کی۔ موسیقی حرام ہے لیکن صرف مزامیر کے ساتھ۔ یعنی اگر انسان اپنے گلے سے آواز نکالے تو ایسا کرنا بالکل جائز اور درست ہوگا۔ لیکن اگر وہی آواز تانبے کی تار سے نکال لی جائے تو وہ حرام ہو جائے گی! ہمارے ہاں

منکرِ مے بودن و ہم رنگِ مستاں زیستن

کا یہی انداز چلا آ رہا تھا کہ محترم محمد جعفر شاہ صاحب پھلواروی نے جرأت کی اور اپنی کتاب اسلام اور موسیقی میں بتایا کہ موسیقی (گلے سے ہو یا سازوں کے ذریعے) نہ اسلام نے حرام قرار دی ہے نہ اسلاف نے اسے ایسا سمجھا ہے۔ کتاب اگرچہ مختصر ہے لیکن محنت سے لکھی گئی ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ محترم شاہ صاحب کی یہ جرأت قابلِ داد ہے لیکن اپنی دیگر تصانیف کی طرح، وہ اس میں بھی کھل کر بات نہیں کرتے بلکہ محفل میں آتے ہیں تو بایں نمط کہ

چو زاہدے کہ بہ بزمِ شراب می آید

حالانکہ بات صاف ہے کہ حرام حرام ہے اور حلال حلال۔ اور ان کے بین بین کوئی راستہ نہیں حلال پر پابندی ہے تو صرف اتنی کہ اس کا استعمال حدود اللہ کے اندر رہتے ہوئے کیا جائے۔

لیکن ایک بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی اور وہ یہ کہ پاکستان میں اس کتاب کی اشاعت سے کیا فائدہ تھا؟ اگر موسیقی بہ نصوصِ صریحہ حلال اور طیب ثابت کر دی جائے تو بھی جو موسیقی یہاں (ریڈیو پاکستان کے تصدق) وجہ عذابِ گوش بنتی ہے وہ تو کسی صورت میں حلال نہیں قرار پا سکتی۔ ہمارا خیال ہے کہ وہ اسی قسم کی موسیقی ہو گی جسے سن کر ہمارے متقدمین نے موسیقی کو حرام قرار دیا تھا۔ ہمارے اربابِ حل و عقد کے کانوں تک اقبال کا یہ پیغام کون پہنچائے کہ

اگر نوا میں ہے پوشیدہ موت کا پیغام   حرام میری نگاہوں میں نائے و چنگ و رباب

محترم شاہ صاحب کی یہ دلچسپ اور پُر از معلومات کتاب ادارہ ثقافتِ اسلامیہ کلب روڈ لاہور سے سوا تین روپے میں مل سکتی ہے۔

قرآنی انقلاب کا لٹریچر

معراجِ انسانیت از:- پرویز
سیرت صاحب قرآن علیہ التحیۃ والسلام کو قرآن کے آئینہ میں دیکھنے کی پہلی اور کامیاب کوشش۔ مذاہب عالم کی تاریخ اور تہذیبی پس منظر کے ساتھ ساتھ حضور سرورِ کائنات کی سیرت اور دین کے متنوع گوشے نکھر کر سامنے آگئے ہیں بڑے سائز کے قریباً نو سو صفحات اعلیٰ ولایتی گلیز ڈکاغذ مضبوط و حسین جلد۔ قیمت بیس روپے

ابلیس و آدم از:- پرویز
سلسلہ معارف القرآن کی پہلی جلد جسے نظر ثانی کے بعد شائع کیا گیا ہے۔ انسانی تخلیق۔ قصۂ آدم جنات ملائکہ وحی وغیرہ جیسے اہم مباحث کی حامل۔ بڑی تقطیع کے ۳۷۶ صفحات۔ قیمت آٹھ روپے

جوئے نور از:- پرویز
سلسلہ معارف القرآن کی دوسری کڑی جو حضرات انبیائے کرام کے تذکارِ جلیلہ پر مشتمل ہے۔ جس میں حضرت نوحؑ سے لے کر حضرت شعیبؑ تک تمام انبیائے کرام علیہم التحیۃ والسلام کا تذکرہ آگیا ہے۔
سائز ۲۹×۲۲ ضخامت ۳۶۸ صفحات۔ قیمت مجلد مع گردپوش چھ روپے

انسان نے کیا سوچا؟ از:- پرویز
فکرِ انسانی کی آج تک کی تاریخ کہ اس نے اپنی مشکلات و مسائل کو حل کرنے کے لئے آج تک کیا سوچا؟ محترم پرویز صاحب کی بلند پایہ تصنیف۔
سائز ۲۹×۲۲ ضخامت ۳۶۸ صفحات۔ قیمت مجلد مع گردپوش دس روپے

سلیم کے نام از:- پرویز
نوجوانوں کے دل میں اسلام سے متعلق جو شکوک پیدا ہوتے ہیں۔ ان کا شگفتہ اور مدلل جواب بڑے سائز کے ۴۰۸ صفحات۔ قیمت چھ روپے

فردوسِ گم گشتہ از:- پرویز
ان مضامین کا مجموعہ جنھوں نے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی نگاہ کا زاویہ بدل دیا ہے اردو لٹریچر کی بلند پایہ تصنیف ۴۱۶ صفحات۔ قیمت چھ روپے

نظامِ ربوبیت از:- پرویز
انسان کے معاشی مسائل کا قرآنی حل اور ذاتی ملکیت کا قرآنی تصور۔ دورِ حاضرہ کی عظیم کتاب۔ بڑا سائز ضخامت ۳۰۰ صفحات۔ قسم اول مجلد چھ روپے۔ قسم دوم غیر مجلد چار روپے

اسبابِ زوالِ امت از:- پرویز
(دوسرا ایڈیشن) مسلمانوں کی ہزار سالہ تاریخ میں پہلی مرتبہ بتایا گیا ہے کہ ہمارا مرض کیا ہے اور اس کا علاج کیا؟ ضخامت ۱۷۲ صفحات۔ قیمت دو روپے

(محصول ڈاک ہر حالت میں بذمہ خریدار ہوگا)

ملنے کا پتہ:- **ناظم ادارہ طلوعِ اسلام** ۱۵۹/۳-ایل پی۔ ای۔ سی ہاؤسنگ سوسائٹی کراچی نمبر ۲۹

CL200

کم خرچ بالا نشین

بیکو کو اپنی مصنوعات پر ہمیشہ ناز رہا ہے۔ بیکو انتہائی فخر سے اپنا بہترین اور جدید ترین خراد سی ایل ۲۰۰ پاکستان میں پیش کرتی ہے یہ خراد اپنی کارکردگی کم خرچ اور قابلِ اعتماد ہونیکے اعتبار سے اپنی نظیر آپ ہے۔ ہماری یہ نئی خراد پاکستان کی صنعت مشین سازی کی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز کرتی ہے۔

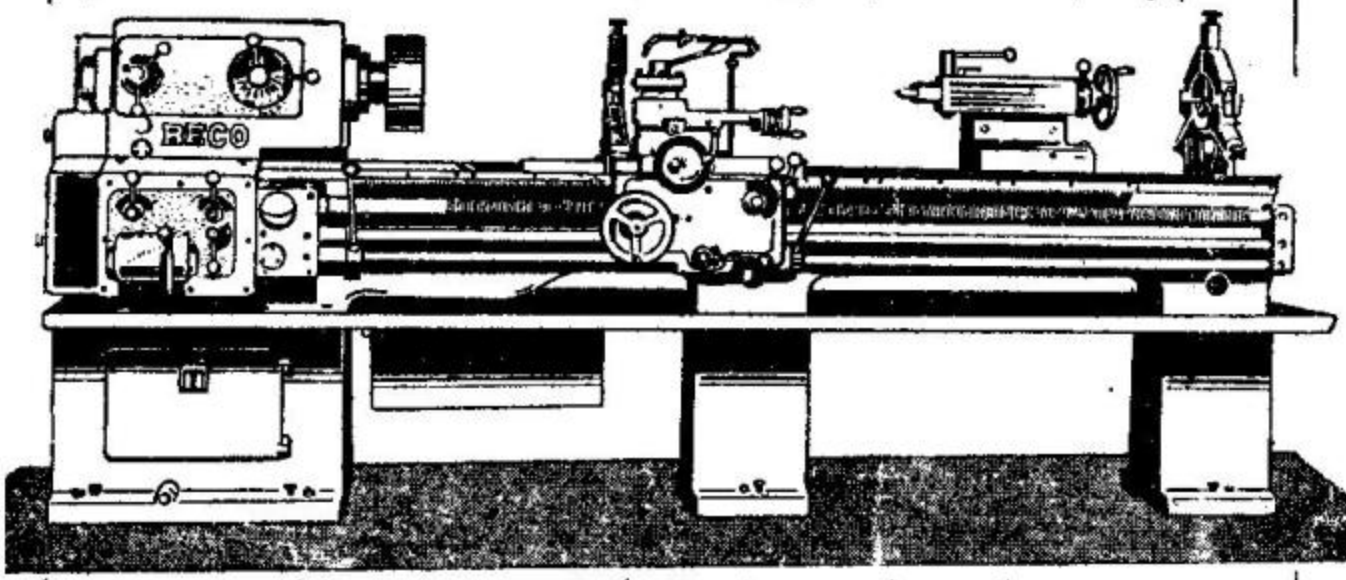

چند خصوصیات:۔ ★ سوئنگ اوور بیڈ ۳/۴ ۱۷ ۔ ۴۵۰ مم۔ ★ سوئنگ اِن گیپ ۱/۲ ۲۵ ۔ ۶۴۰ مم ★ سینٹر ڈسٹینس ۸-۲ ۲۵۰۰ مم ★ ۱۲ قسم کی رفتار (۱۷ سے ۵۰، گردش فی منٹ) ★ چوڑی کٹائی کا ایسا انتظام کہ تمام مروجہ سائزوں میں ہو سکتی ہے ★ بجلی سے چلانے پر میکانکی سلائیڈ اور سرفیسنگ وغیرہ کی سہولتیں۔ ★ پانچ گھوڑوں کی طاقت والی موٹر۔ (اپنی مشین ابھی سے بک کرائیے)

تفصیلات کیلئے مندرجہ ذیل پتہ پر رجوع کیجئے

BECO — بٹالہ انجینئرنگ کمپنی (پاکستان) لمیٹڈ — بیکو

کراچی فون ۳۰۰۲۳ لاہور فون ۲۱۶۳ چاٹگام فون ۵۲۳۸

باب المراسلات

حضرت عائشہؓ کی عمر شادی کے وقت

محترم پرویز صاحب زاد لطفہٗ السلام علیکم۔

ماہ نومبر کے طلوع اسلام میں آپ کا مقالہ "حضرت عائشہؓ کی عمر شادی کے وقت" پڑھا۔ اس میں آپ نے ایک ایسی حقیقت کا انکشاف کیا ہے جس پر کم و بیش ایک ہزار سال سے پردہ پڑا ہوا تھا۔ مولوی کی روایت پرستی نے تحقیق و تفحص کا دروازہ بند کر رکھا تھا۔ زمانے نے سینکڑوں کروٹیں بدلیں۔ اور مخالفین و اعدائے اسلام نے آنحضرت صلعم کی سیرت طیبہ کے اس گوشہ پر ناپاک حملے کیے۔ مگر مولوی ٹس سے مس نہ ہوا۔ حضور اکرم صلعم کی سیرت کا مطالعہ کرتے وقت سلیم الطبع مسلمان حضرت عائشہؓ کے متعلق (THE CHILD WIFE OF MOHAMMAD) (محمدؐ کی صغیر السن بیوی) کا طعن آمیز خطاب سنتا، پیچ و تاب کھاتا تھا اور اس کو ایک عقدہ لاینحل خیال کر کے شرم سے آنکھیں نیچی کر کے آگے بڑھ جاتا تھا۔ لیکن آپ کے ناخن گرہ کشا نے معجزانہ طور پر انھیں کتب سے جن کو مولوی اپنی وراثت بنائے بیٹھا تھا اس حقیقت کو واشگاف کیا کہ حضرت عائشہؓ کی عمر آنحضرت صلعم سے نکاح کے وقت سترہ سال کی اور رخصتی کے وقت قریباً انیس سال کی تھی۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک۔

حضرت عائشہؓ کا نکاح آنحضرت صلعم سے کس سال ہوا؟ آپ جس نتیجہ پر پہنچے ہیں۔ اس کو ایک دوسرے طریقہ سے بھی ثابت کیا جا سکتا ہے میری تحقیق میں نکاح اور رخصتی دو الگ الگ واقعات ہیں۔ نکاح کو منگنی سے تعبیر کرنے کی ضرورت نہیں۔

ایک عام اور مشہور روایت ہے کہ آنحضرت صلعم سے حضرت عائشہؓ کا نکاح ۱۰ نبوت میں ہوا۔ یہ غلط ہے صحیح یہ ہے کہ نکاح ہجرت کے سال ہوا۔ اس کا ثبوت صحیح بخاری کی ایک حدیث سے ملتا ہے جو خود حضرت عائشہؓ سے مروی ہے:۔

عن عائشہ قالت ما غرت علی امرأۃ ما غرت علی خدیجۃ من کثرۃ ذکر رسول اللہ صلعم قالت وتزوجنی بعدھا بثلاث سنین وامرہ ربہ عزوجل او جبریل علیہ السلام ان یبشرھا ببیت فی الجنۃ من قصب (بخاری فضائل صحابہ)

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے۔ فرمایا کہ میں نے کسی عورت پر اتنا رشک نہیں کیا جتنا میں نے خدیجہؓ پر کیا۔ رسول اللہ صلعم کا بکثرت ان کا ذکر کرنے کی وجہ سے۔ (نیز) فرمایا کہ رسول اللہ صلعم نے ان کی وفات کے تین سال بعد مجھ سے نکاح کیا۔ اور ان کو اللہ عزوجل نے یا جبریل علیہ السلام نے حکم دیا کہ ان (خدیجہ) کو جنت میں ایک محل کی خوشخبری دیں جو موتی کا ہوگا۔

حضرت خدیجہؓ کا سن وفات بالاتفاق سنہ ۱۰ نبوت ہے۔ یعنی ہجرت سے تین سال قبل (بخاری[1]) لہذا اس حدیث کے مطابق حضرت عائشہؓ کا نکاح وفاتِ خدیجہؓ سے تین سال بعد یعنی مکہ میں ہجرت کے واقعہ سے متصل زمانے میں ہوا۔

اب صورت یہ ہوئی کہ کتب تاریخ وسیر سے جن میں سیرت کے متعلق قوی اور ضعیف دونوں طرح کی روایات ملتی ہیں استمداد کئے بغیر ہم کو صحیح بخاری اور اسماء الرجال سے یہ حقائق مل جاتے ہیں۔

(۱) حضرت عائشہؓ کا نکاح سنہ ۱۳ نبوت میں ہجرت سے قریب تر زمانے میں ہوا۔ (بخاری)

(۲) اُس وقت ان کی عمر سترہ سال کی تھی۔ (اکمال فی اسماء الرجال)

رہا رخصتی کا سوال۔ یہ مدینہ میں ہوئی۔ سنہ ۲ھ کی روایات اس کے متعلق صحیح معلوم ہوتی ہیں۔ اس وقت حضرت عائشہؓ کی عمر تقریباً انیس سال کی تھی۔ رخصتی میں تاخیر کی وجہ وہ احوال وحوادث ہیں جو مدینہ پہنچ کر آنحضرت صلعم اور خاندان ابوبکرؓ کو پیش آئے۔

(نیازمند) بشیر احمد سوی (راولپنڈی)

---

[1] توفیت خدیجة قبل مخرج النبی صلعم الی المدینة بثلاث سنین فلبث سنتین او قریباً من ذالک ... (بخاری)
خدیجہؓ آنحضرت صلعم کے مدینہ ہجرت فرمانے سے تین سال قبل فوت ہوئیں۔ پھر وہ دو سال یا اس کے قریب مدت میں تنہا بغیر زوج کے رہے۔ یہ دو سال عرب کے سن شماری کے طریقہ سے "خالی" کے دو سال ہیں جو سنہ ۱ ہجرت اور سنہ ۱۳ نبوت کے درمیان آتے ہیں۔

اِنڈس

خوبصورت اور پائیدار شیشہ کے برتنوں کا ضامن ہے

ہمارے ہاں

ہر قسم کے شیشہ کے ظروف۔ جگ۔ گلاس۔ برنیاں وغیرہ رنگین وسادہ۔ منقش وپھول دار چمنیاں وگلوب بوتلیں واسٹیشنری اشیاء وبلاگ گلاس تیار ہوتے ہیں۔

پتہ:۔ اِنڈس گلاس ورکس لمیٹڈ پوسٹ بکس ۵

گولیمار روڈ — حیدرآباد (مغربی پاکستان)

آپ نے کبھی سوچا؟

شگفتگی۔ طراوت اور تبسم کے پیچھے کیا کارفرما ہے!
گرم دوپہر ہو یا ہوا اگر وہ ذرا بھی سرد ہو جائے تو آپ زرد پڑ جاتی ہیں۔
اسکی وجہ؟ آپ کی استعمالی اغذیہ میں اہم حیاتین کی کمی ہے۔ اس کمی کے تدارک کیلئے آپ کو مرغن غذاؤں کی نہیں بلکہ ......

وِم وائٹ (۲۵ ضروری حیاتین کا مرکب)

کی ضرورت ہے جسے آپ کی صحت، توانائی اور تازگی کے لئے تیار کیا گیا ہے۔ اپنی شگفتگی کو برقرار رکھنے کے لئے آج ہی **وِم وائٹ** خریدیئے۔
ایک گرانقدر علمی تحفہ۔ ایک حیرت انگیز سائنسی تجربہ۔ امریکہ میں بنا ہوا۔ ہر دوا فروش سے ملتا ہے۔

آپ رشک کرتے ہیں!

کسی مضبوط اور متناسب جسم کو دیکھ کر۔ کیونکہ آپ لاغر ہیں یا پھر دیسی صحت کے اسباب ڈھونڈ نہیں پاتے۔ آیئے ہم آپ کی مشکل حل کریں۔ کیا آپ اعتماد کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ آپ کی غذا نظام جسمانی کی قطعی ضروریات کو پورا کر رہی ہے؟ کیا آپ کو حیاتین ٹھیک طور پر مہیا ہو رہی ہیں؟ یقیناً کوئی تشفی بخش جواب آپ کے پاس نہیں۔

وِم وائٹ (۲۵ ضروری حیاتین کا مرکب)

ایک گرانقدر علمی تحفہ۔ ایک حیرت انگیز سائنسی تحفہ آپ کی مشکل کا حل ہے۔ جسے استعمال سے آپ تیزی سے ایک توانا اور قابل رشک صحت نصیب کر سکیں گے۔
[illegible] آپ کی صحت کا ضامن۔ امریکہ میں بنا ہوا۔ ہر دوا فروش سے ملتا ہے۔

اپنے بچے کو آپ صحتمند، توانا اور بشاش دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس لئے آپ صحت افزا اور مقوی اشیا کی تلاش کرتے ہیں یہ ایک حقیقت ہے کہ اکثر بچے اپنی ماں باپ سے ورثہ میں ناقص خون پاتے ہیں۔ یا بچہ بالخصوص ماں کے دودھ سے محروم رہتے ہیں۔ اور بازاری دودھ کے سہارے پروان چڑھتے ہیں۔ ان صورتوں کے علاوہ بھی اکثر صحت ضروری حیاتین کی کمی کے باعث ناقص رہتی ہے اور کوئی بھی مرض غلبہ پا سکتا ہے۔

بچے کو ان تمام خدشات سے محفوظ رکھنے کے لئے

وِم وائٹ (۲۵ ضروری حیاتین کا مرکب) خریدیئے

وم وائٹ جو ان تمام چیزوں کے پیش نظر تیار کیا گیا ہے صحت کی مکمل ضمانت ہے۔ آپ کے بچے کے اندرونی نظام کا محافظ۔ امریکہ میں بنا ہوا۔ ہر دوا فروش سے ملتا ہے۔

مطبوعات طلوع اسلام کی
شرائط ایجنسی

شرح کمیشن۔ سلسلۂ معارف القرآن۔ (۱) معراج انسانیت (۲) ابلیس و آدم (۳) جوئے نور (۴) انسان نے کیا سوچا؟
۲۵ فیصدی۔ دیگر مطبوعات ۳۳ فیصدی

قیمت بعد وضع کمیشن بذریعہ وی پی وصول کی جائیگی۔ غیر فروخت شدہ واپس نہیں لی جائیں گی پہلی فرمائش پچاس روپے بعد وضع کمیشن سے کم نہیں ہونی چاہیئے۔ ہر آرڈر کے ہمراہ کم از کم چوتھائی رقم پیشگی آنی چاہیئے۔ ورنہ تعمیل نہ ہوسکیگی۔ کراچی کے ایجنٹ صاحبان دفتر طلوع اسلام سے معاملے کریں۔

ناظم ادارۂ طلوع اسلام

ضرورتِ رشتہ

ایک نوجوان معمولی زمیندار میٹرکولیٹ جے وی مدرس بمشاہرہ ۸۹/۱۰/۱۰ روپے ماہوار کیلئے نیک سیرت و صورت رشتہ درکار ہے۔ خواہشمند حضرات پتہ ذیل پر خط و کتابت کریں۔

ک۔ ب۔ معرفت ادارۂ طلوع اسلام۔ ۱۵۹/۳۰، پی۔ ای۔ سی ہاؤسنگ سوسائٹی، کراچی ۲۹

خط و کتابت کرتے وقت

خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیجئے۔ ورنہ عدم تعمیل کی شکایت معاف۔

ناظم ادارہ

ملائم جلد اور دلکش نکھار کیلئے

لیلیٰ کریم ٹوائیلٹ صابن

ذوالفقار انڈسٹریز
کراچی

چھوٹا مسواک ٹوتھ برش
Hashmi
دانتوں کی صفائی بچوں کو صحت مند اور توانا رکھتی ہے
چھوٹے بچوں کے لئے چھوٹا مسواک
نایاب تحفہ ہے
جو نرم ونازک مسوڑوں کے لئے بے ضرر ہے اور
جس کا استعمال بچوں کیلئے مفید ترین مشغلہ ہے